معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپیے　　فی شمارہ سات روپیے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ　　ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ
بالمقابل ایس۔ ایم۔ کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

جلد ۱۶۱　ماہ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۹۸ء　عدد ۴

فہرست مضامین

شذرات

بالآخر مرکز میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی مخلوط حکومت بن گئی اور وزیرِ اعظم بننے کی مسٹر اٹل بہاری باجپائی کی تمنا برآئی، وزیرِ اعظم تو وہ ۱۹۹۶ء میں بھی ہوئے تھے مگر وہ "نامبارک ساعت" تھی، تیرہ[۱۳] دنوں ہی میں انہیں مستعفی ہوجانا پڑا تھا۔ اب کے وہ "مبارک گھڑی" میں اس منصب پر فائز ہوئے ہیں اور آثار و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی حکومت شعلۂ مستعجل نہ ہوگی، تیرہ جماعتوں کے متحدہ محاذ نے جب اپنی حکومت بنائی تھی تو باجپائی جی اور ان کے ساتھی اس کا مذاق اڑاتے تھے اب انہوں نے خود اٹھارہ[۱۸] پارٹیوں کو جن میں مزید اضافہ ہو رہا ہے ملا کر حکومت بنائی ہے تو پتہ نہیں اس کے متعلق ان کا کیا خیال ہے، متحدہ محاذ کی جماعتوں میں تو یک گونہ ہم آہنگی، یکجہتی اور فکری و نظریاتی اتحاد بھی تھا جبکہ یہاں یہ حال ہے کہ ایک دوسرے سے بالکل ہی متضاد و مختلف خیالات رکھنے والی جماعتوں کو محض موقع پرستی، خود غرضی اور اقتدار کی ہوس نے ایک ساتھ کر دیا ہے ورنہ ان میں کوئی تال میل نہیں۔

اس سے بحث نہیں کہ حکومت عارضی ہوگی یا دیرپا، سوال اس کا ہے کہ حکومت و اقتدار حاصل کرنے کیلئے اصول پسندی و ایمانداری کے مدعیوں اور رام بھگتوں کی اس جماعت نے کیا طریقے اختیار کیے؟ کیسے لوگوں سے ہاتھ ملایا؟ کیسی سودے بازی کی؟ "جو کہتے ہیں سو کرتے ہیں" کی راگ الاپنے والوں کو دنیا نے دیکھا کہ اپنا اصل ایجنڈا بالائے طاق رکھ کر جھٹ پٹ دوسرا نام نہاد قومی ایجنڈا تیار کر لیا، بدعنوانیوں سے پاک اور صاف ستھری حکومت دینے کا وعدہ کرنے والوں نے کرپشن میں ڈوبی ہوئی پارٹیوں اور افراد سے سمجھوتا کر لیا، ایک سابق مرکزی وزیر کے گھپلوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے تیرہ[۱۳] روز تک ایوان کی کارروائی نہ چلنے دینے والوں نے اسی کو گلے لگا کر ایک صوبہ میں اپنی حکومت بنا لی۔ اترپردیش میں اپنی حکومت بچانے کے لیے مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والوں اور مشتبہ کردار کے لوگوں کو وزارتیں بخش دیں۔ اب مرکزی کابینہ میں بھی ایسے لوگ شامل کیے جا رہے ہیں جن پر بدعنوانیوں میں ملوث ہونے کا الزام ہے

اور جنکے خلاف کرپشن کے انسداد کے تحت عدالتوں میں مقدمات چل رہے ہیں، لوک سبھا کے اسپیکر کے انتخاب اور دوسری پارٹیوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے جوڑ توڑ اور دھاندلی کے باوجود نہ جانے کس منھ سے کرپشن اور بدعنوانی سے پاک صاف ہونے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔

دراصل بی۔ جے۔ پی کی ان حرکتوں نے اس کو اور زیادہ بے نقاب اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستانی سیاست میں موقع پرستی اور مفاد پرستی کا بول بالا ہو گیا ہے اور اصول و نظریات نام کی کوئی چیز ہی نہیں رہ گئی ہے، کرپشن اور بدعنوانی اسی وقت تک کے لیے معیوب اور لعنت ہے جب اس کا تعلق بی۔ جے۔ پی کے سیاسی مخالفین سے ہو، جو بدعنوان اس کا ساتھ نہ دے اسکی ناک میں وہ دم کر دے گی اور جس نے اس سے ہاتھ ملا لیا وہ دودھ کا دھلا ہو گیا اور اسکی ہر خطا معاف ہو گئی، دوہرا معیار، دورخی اور تضاد بیانی اس کا شیوہ ہے، ایک طرف دکھانے کے لیے قومی ایجنڈا ہے لیکن پس پردہ خفیہ ایجنڈا بھی ہے، وزیرِ اعظم سیکولرازم کی بات کرتے اور انکے بعض ساتھی تو یہ بھی کہتے ہیں کہ بھارت جیسے کثیر المذاہب ملک میں کسی ایک مذہب و فرقہ کی حکومت نہیں ہو سکتی مگر پارٹی کے صدر، اترپردیش کے وزیرِ اعلیٰ اور کئی دوسرے ہندوتوا سے دستبردار نہ ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اجودھیا میں رام مندر بنایا جائے گا، اور کاشی، متھرا، یکساں سول کوڈ اور دفعہ ۳۷۰ ایجنڈے سے خارج نہیں ہے۔ وزیرِ اعظم حکومت کے ریموٹ کنٹرول سے چلائے جانے کی تردید کرتے ہیں اور آر۔ ایس۔ ایس کے جنرل سکریٹری کہتے ہیں "آر ایس ایس بی۔ جے۔ پی کی قیادت میں قائم مرکزی حکومت پر اپنے اثرات استعمال کرے گی" اور معاون جنرل سکریٹری کہتے ہیں "حکومت سازی کے معاملہ میں بی۔ جے۔ پی قیادت نے آر۔ ایس۔ ایس سے صلاح و مشورہ کیا تھا اور اسکے مشورے سے ہی منسٹرس کو وزارتیں دی گئی ہیں۔"

وزیرِ اعظم کا یہ خیال غلط ہے کہ بی۔ جے۔ پی کو عوام نے حکمرانی کا اختیار دیا ہے اور اسکے حلیفوں کو ۲۰ فیصدی سے زیادہ ووٹ نہیں ملے بلکہ بعض جماعتوں نے متحدہ محاذ کے نام پر ووٹ حاصل کرنے کے بعد نہایت ڈھٹائی سے بی۔ جے۔ پی سے پینگ بڑھالی، تب ہی تو اسکی اکثریت ہوئی اور وہ اعتماد کا ووٹ حاصل کر سکی گو اسکے لیے بھی کافی پاپڑ بیلنے اور ناجائز طریقے اختیار کرنے پڑے۔ وزیرِ اعظم نے مسلمانوں کی اقتدار میں ساجھے داری، انکے ساتھ مساویانہ برتاؤ اور انکے حقوق کے مکمل تحفظ وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے اپوزیشن پارٹیوں پر الزام لگایا ہے کہ وہ بی۔ جے۔ پی کا ہوا کھڑا کر کے مسلمانوں کو گمراہ اور اس سے متنفر اور

بدگمان کرتی ہیں. مخالف پارٹیوں کی صفائی پیش کرنے کا حق ہم کو نہیں ہے لیکن بی. جے. پی اپنا پچھلا ریکارڈ دیکھے تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اس سے مسلمانوں کے شکوک و شبہات اور بدگمانی بلاوجہ نہیں ہے اور اسکی ذمہ دار اپوزیشن پارٹیاں نہیں بلکہ مسلمانوں کے تئیں خود بی. جے. پی کا رویہ ہے باتیں ایک دو ہوں تو گنائی بھی جائیں رہا مستقبل کے بارے میں ان کا اعلان تو وہ بھی پچھلے تجربوں کی موجودگی میں طفل تسلی ہی سمجھا جائے گا، کون نہیں جانتا کہ وعدہ و حلف شکنی اور یقین دہانی کا عدم ایفا ان کی پارٹی کی عام روایت ہے۔

ان صفحات میں گزشتہ ماہ سیرۃ النبی حصہ سوم کی طباعت کا ذکر آیا تھا جو انشاء اللہ چند ماہ میں طبع ہو جائے گی ہم نے ارباب خیر سے اسکے اخراجات کی ذمہ داری قبول کر لینے کی درخواست بھی کی تھی جو ابھی تک مسموع نہیں ہوئی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عقیدتمندوں کا حلقہ وسیع ہے انکے ذی اثر و رسوخ بعض تلامذہ بھی الحمد للہ موجود ہیں اگر وہ خود نہیں تو دوسروں کو طباعت کے مصارف کا متکفل ہو جانے کے لیے آمادہ کر سکتے ہیں کوئی تنہا یہ بار نہ اٹھا سکتا ہو تو چند اشخاص مل کر اس کار خیر میں تعاون کر سکتے ہیں دس اشخاص بھی دس دس ہزار کی رقم مہیا کر دیں تو سیرت حصہ سوم طبع ہو جائے گی. الحمد للہ چوتھے حصہ کی تصحیح و مراجعت اور کمپوزنگ کا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔

یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ ایک بڑے عالم و فاضل اور محقق پروفیسر مقبول احمد کی وفات کی خبر ملی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و اسلامیات سے برسوں وابستہ رہے انہی کی کوششوں سے یونیورسٹی میں ویسٹ ایشین اسٹڈیز کا شعبہ قائم ہوا پھر کشمیر چلے گئے اور کشمیر یونیورسٹی میں سینٹرل ایشین اسٹڈیز کا سینٹر اور اسلامی کتب و نوادر کا میوزیم قائم کیا، شاہ حسین کی دعوت پر مشیر تعلیم کی حیثیت سے اردن گئے، مغربی ممالک کی سیاحت بھی کی، برسوں آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کے جنرل سکریٹری رہے جس کے باوقار سمینار ملک بھر میں ہوتے تھے، حکومت ہند کے عربی مجلہ ثقافۃ الہند کے مدیر اور ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے سہ ماہی رسالہ اسلام و عصر جدید کی ادارت سے بھی منسلک رہے، ریٹائرڈ ہونے کے بعد پروفیسر ایمریٹس ہوئے تصنیف و تالیف سے برابر اشتغال رہا اور مختلف علمی و تحقیقی کام انجام دیے، شریف ادریسی کی شہرۂ آفاق تصنیف نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق کے ہندوستان سے متعلق حصے کی اشاعت انکا بڑا کارنامہ ہے جس کو انکے عالمانہ مقدمہ انڈکس اور محققانہ حواشی نے چار چاند لگا دیے، اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں بھی انکے درجات بلند کرے آمین!!

مقالات

ابو مسلم اصفہانی کے تفسیری اقوال

از: محمد عارف اعظمی عمری، رفیق دار المصنفین

خلافت عباسیہ کے زمانے میں اسلامی مملکت کے حدود بہت وسیع ہو جانے کی وجہ سے مختلف اقوام و ملل سے مسلمانوں کا اختلاط ہوا اور وہ مختلف النوع تہذیب و ثقافت اور مذہبی افکار سے متعارف ہوئے اسی عہد میں ہندوستان، ایران اور یونان کی فلسفیانہ کتابیں بھی نقل و ترجمہ ہو کر عام مسلمانوں تک پہونچیں۔ اس طرح مذہب و اعتقاد کے بارہ میں عقلی اور فلسفیانہ بحثوں کا آغاز ہوا، جس نے آگے چل کر مستقل ایک علم کی صورت اختیار کر لی، جو علم کلام کے نام سے موسوم ہے۔

خلفائے عباسیہ مامون، معتصم اور واثق نے اپنے عہد حکومت میں علم کلام کی سرپرستی کی اور عقلی بحثوں کے نتیجہ میں خود مسلمانوں میں متعدد مکاتب وجود میں آئے۔

اسلامی فرقوں میں معتزلہ کو علم کلام میں سب سے زیادہ دسترس حاصل ہوئی، اسکے مقابلہ میں محدثین اور علمائے منقولات نے علم کلام کی سخت مخالفت کی مگر معتزلہ نے خلفائے عباسیہ کے زیر سایہ محدثین کو طنز و تعریض کا نشانہ بنانا شروع کیا اور بعض محدثین پر بڑے مظالم بھی ڈھائے گئے، جن میں امام احمد بن حنبلؒ سر فہرست ہیں۔

بالآخر معتزلہ کی بساط پلٹ گئی اور اسی کے ساتھ علم کلام کا عہد زریں بھی ختم ہو گیا۔

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں علم کلام کے اصول کو مد نظر رکھ کر متعدد کتابیں

لکھی گئیں مگر یہ تمام کتابیں گردشِ روزگار کی نذر ہوگئیں۔ اسی دور کی ایک اہم تصنیف ابو مسلم اصفہانی کی تفسیر جامع التاویل لمحکم التنزیل بھی ہے۔ جس میں قرآنِ مجید کی تفسیر عقل کے سواس کی گئی ہے، مگر اس دور کی دیگر تصنیفات کی طرح یہ تفسیر بھی ناپید ہے۔ البتہ امام رازی نے اپنی تفسیر میں جابجا اس کے اقتباسات نقل کیے ہیں اور یہی اقتباسات اس تفسیر کا باقی ماندہ سرمایہ ہیں۔

ابو مسلم کے حالات زندگی ابو مسلم ایک بلند پایہ مفسر اور زبان و ادب کے ماہر تھے۔ علامہ ابن کثیر نے گو ان کے طریقۂ تفسیر پر نکیر کی ہے مگر ان کو مفسر کا لقب دیا ہے[1]۔ ان کا نام محمد اور والد کا نام بحر تھا[2]۔ علامہ ذہبی کی ایک روایت یہ ہے کہ ان کے والد کا نام علی اور دادا کا مہرابزد تھا[3]۔

ابو مسلم ۲۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ علمی لیاقت کے ساتھ انتظامی صلاحیت کے بھی مالک تھے۔ خلیفہ مقتدر نے ان کو اصفہان اور فارس کا نائب مقرر کیا تھا، علی بن بویہ کے قبضہ سے پہلے تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے۔ ۳۲۱ھ میں آل بویہ نے ان کو معزول کر دیا، اسکے بعد دوسرے برس ۳۲۲ھ میں انہوں نے وفات پائی[4]۔

افسوس ہے کہ ان کے مزید حالاتِ زندگی کا سراغ نہیں ملتا۔

عقیدہ و مسلک ابو مسلم اصفہانی کے بارے میں عام شہرت یہ ہے کہ وہ معتزلی تھے۔ ابن ندیم نے ان کی تفسیر کو معتزلی الفکر بتایا ہے[5]۔ علامہ شبلی نے بھی ان کے بارہ میں یہ

۱؎ تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۵۱ مطبعہ مصطفی محمد مصر ۲؎ کتاب الفہرست ص ۹۶، تفسیر کبیر امام رازی، ج ۱ ص ۷۷ ۳؎ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۰۶ ۴؎ ملتقط جامع التاویل مرتبہ مولانا محمد سعید انصاری مقدمہ ۵؎ کتاب الفہرست ص ۱۹۶۔

خیال ظاہر کیا ہے کہ ان پر اعتزال کا داغ ہے[1]۔ مگر علامہ ابوبکر الجصاص حنفی جو ابو مسلم کے قریب العہد ہیں وہ ابو مسلم کو صحیح الاعتقاد بتاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں نسخ کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے ابو مسلم کا نام لیے بغیر اس کے نقطۂ نظر کی تردید کی ہے۔ امام رازی نے تصریح کی ہے کہ ابو مسلم کا نظریۂ نسخ جمہور مفسرین کے برعکس ہے۔ وہ اس سے گزشتہ انبیاء کی شریعتوں کا نسخ مراد لیتے ہیں جس کا قائل ان کے علاوہ کوئی نہیں ہے[2]۔ چنانچہ ابوبکر الجصاص اس نقطۂ نظر کی تردید کرکے اس کے قائل کی شخصیت اور اس کے عقیدہ و مسلک کو بھی زیر بحث لائے ہیں، ظاہر ہے کہ انکی مراد ابو مسلم ہی سے ہوسکتی ہے، لکھتے ہیں:

"متاخرین میں ایک غیر فقیہ کا خیال ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں نسخ کا وجود نہیں ہے بلکہ اس میں نسخ کا جہاں ذکر آیا ہے اس سے انبیائے سابقین کی شریعتوں کی منسوخی مراد ہے۔ مثلاً سبت کی اہمیت اور مشرق و مغرب کی جانب رخ کرکے نماز پڑھنا وغیرہ......

یہ صاحب جنھوں نے یہ بات لکھی ہے وہ بلاغت اور علوم لغت کے بڑے واقف کار تھے لیکن علم فقہ و اصول فقہ میں ان کو درک نہیں تھا، ان کا عقیدہ درست تھا اور اس میں کسی بدگمانی کا امکان نہیں تاہم وہ بہت زیادہ قابلِ اعتنا نہیں ہیں، نسخ کے باب میں انہوں نے غلطی کی اور وہ بات کہی جو ان سے پہلے کسی نے نہیں کہی انہوں نے ناسخ و منسوخ کی بحث میں امت کے برخلاف اپنی رائے ظاہر کی اور پتہ نہیں تاویل کے غلط معانی کیوں پہنائے۔ میرا زیادہ گمان یہ ہے کہ ایسا اس وجہ سے ہوا کہ نصوص پر ان کی نظر گہری نہ تھی اور ان کو سلف کے اقوال کی خبر نہ تھی چنانچہ انہوں نے

۱؎ علم الکلام ص ۴۴ ۲؎ تفسیر کبیر ج ۱ ص ۶۶۲۔

رائے کا استعمال بکثرت کیا ہے، وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد صادق آتا ہے کہ جو قرآن میں اپنی رائے کو دخل دے وہ گو صحیح کہے مگر خطا کار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اور ان کی مغفرت فرمائے۔[1]

علامہ ابوبکر الجصاص کے اس بیان سے یہ تو بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ابومسلم اصفہانی کا اعتزال سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ ان کا عقیدہ و مسلک علمائے اہل سنت کے موافق ہی تھا۔ رہے ان کے تفردات تو ان کے متعلق ابوبکر الجصاص کی رائے اس لیے حیرت انگیز نہیں ہے کہ اکثر معقولی مفسرین کے بارہ میں علمائے منقولات کے تاثرات اسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

تفسیر جامع التاویل لمحکم التنزیل ابن الندیم نے اس تفسیر کو بڑی ضخیم بتایا ہے۔[2] حاجی خلیفہ نے تصریح کی ہے کہ یہ تفسیر چودہ جلدوں میں تھی[3] مگر اس وقت اس کا محض اسی قدر حصہ دستیاب ہے جو تفسیر کبیر میں موجود ہے۔

ابومسلم کے تفسیری اقوال کی اشاعت اردو خواں طبقہ میں ابومسلم کے تفسیری اقوال کا تعارف غالباً سب سے پہلے علامہ شبلی نعمانی نے اپنی تصنیف علم الکلام میں کرایا اور اسکے کچھ اقتباسات بھی نقل کیے۔ انھوں نے اس کے تعارف میں لکھا کہ:

"یہ تفسیر اس رتبہ کی ہے کہ باوجودیکہ اس کے مصنف پر اعتزال کا داغ ہے تاہم امام فخر الدین رازی اس کی نسبت لکھتے ہیں ابومسلم حسن الکلام فی التفسیر کثیر الغوص علی الدقائق واللطائف یعنی ابومسلم کا کلام تفسیر میں نہایت خوب ہوتا ہے وہ باریک اور لطیف باتوں کو تہہ سے ڈھونڈ کر نکالتا ہے۔"[4]

[1] احکام القرآن ابوبکر الجصاص ج ۱ ص ۵۹ [2] کتاب الفہرست ص ۱۹۶ [3] کشف الظنون ج ۱ ص ۵۳۰ [4] علم الکلام ص ۴۷۔

غرض ان اقوال کی اہمیت کے پیش نظر مولانا محمد سعید انصاری سابق رفیق دار المصنفین نے ان کو تفسیر کبیر سے یکجا کرنے کا کام شروع کیا جس کا ذکر مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے معارف کے شذرات میں یوں ہے:

"اس سلسلہ میں ارباب علم کو ایک اور خوان نعمت کی ہم خوش خبری سناتے ہیں، عربی زبان میں عقلی طور پر تفسیر کبیر امام رازی کے طرز پر جو تفسیریں لکھی گئیں ان میں سب سے بہتر ابومسلم اصفہانی کی تفسیر ہے جس کی خود امام رازی نے بے انتہا داد دی ہے اور جا بجا ان کی تفسیر کے اقوال بلفظہا انہوں نے نقل کیے ہیں۔ تفسیر مذکور اب دنیا سے ناپید ہے اس کا ایک صفحہ بھی کہیں مل جائے تو قدر دانوں کے نزدیک لعل و گوہر سے بھی گراں تر ہے۔

جن قدمائے مصر و یونان و روم کی تصنیفات ناپید ہو گئی ہیں اور پچھلی کتابوں میں ان کے جو حوالے اور نقلیں موجود ہیں ان کو یورپ نے یکجا کر دیا ہے، ہم یہ چاہتے تھے کہ تفسیر کبیر کے ناپیدا کنار دریا میں ابومسلم اصفہانی کے جو گہر ہائے آبدار پڑے ہیں ان کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیا جائے۔ تفحص و تلاش سے یہ پتہ چلا ہے کہ اس مقصد میں بے انتہا کامیابی ہو سکتی ہے، چنانچہ مولوی محمد سعید انصاری رفیق دار المصنفین اس خدمت میں مصروف ہیں، جس رفتار سے وہ کام کر رہے ہیں اس سے امید ہوتی ہے کہ چند مہینوں میں یہ اختتام کو پہنچ جائے گا۔"[1]

ابومسلم کے تفسیری اقوال کا یہ مجموعہ گو ۱۹۱۶ء میں ہی مکمل ہو گیا تھا مگر اس کی طباعت میں تاخیر ہوتی گئی بالآخر ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء میں یہ مجموعہ بعنوان "ملتقط جامع التاویل لمحکم التنزیل"

[1] شذرات سلیمانی حصہ اول ص ۱۱۱ (نومبر ۱۹۱۶ء)

طبع ہوکر منظرِ عام پر آیا۔ اس کی طباعت مولانا ابوالکلام آزاد کے پریس مطبعہ البلاغ کلکتہ میں ہوئی۔ اس کے آغاز میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ایک فصیح و بلیغ عربی مقدمہ ہے۔ چنانچہ اس کی طباعت کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کی اطلاع معارف کے ذریعہ یوں دی:

"دارالمصنفین نے امام ابومسلم اصفہانی کی گم شدہ تفسیر کے جو اقتباسات امام رازی کی تفسیر سے یکجا کرائے تھے وہ ایک مدت سے ٹائپ میں زیرِ طبع تھے وہ اب چھپ کر بحمداللہ شایع ہوگئے، ۱۰۰ صفحات میں یہ اقتباسات آئے ہیں، سورتوں کی ترتیب کی ترتیب ہے، اہلِ علم حضرات، عربی داں اصحاب اور علمائے دین سے امید ہے کہ اس کی قدر فرمائیں گے، اگر یہی کام یورپ میں کسی مستشرق سے ہوا ہوتا تو اس کی قدر شناسی کا کیا عالم ہوتا"[1]

کلامی تفسیروں پر ابومسلم کے اثرات

علامہ شبلی نعمانی نے قدیم علم کلام کے بارہ میں بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ:

"قدیم علم کلام کا جو حصہ اس وقت بکار آمد تھا آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا"[2]

چنانچہ ابومسلم اصفہانی کے تفسیری اقوال کی اہمیت و افادیت ان کے زمانہ ہی کی طرح اس وقت بھی ہے جس کا اندازہ دورِ جدید کی کلامی تفسیروں کے مطالعہ سے بخوبی ہوتا ہے۔ ہمارے پیشِ نظر ہندوستان میں لکھی گئی چند متداول اردو تفسیریں ہیں جو جدید ذہن کے شبہات کو بھی مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ ان تفسیروں پر ابومسلم کا گہرا اثر ہے۔

ذیل میں ابومسلم اصفہانی کے چند منتخب اقوال پیش کیے جاتے ہیں جن سے انکی تفسیری

[1] شذرات سلیمان حصہ اول ص ۴۴، ۱۷، ۵، ۱۹۴۵ (مئی ۱۹۳۳ء)، [2] علم الکلام، مقدمہ ص ۳۔

انفرادیت کا اندازہ ہوگا پھر ان اردو تفسیروں پر اس کے اثرات کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔ اردو تفسیروں تک ہی جائزہ کو محدود رکھنے کی وجہ اول تو یہ ہے کہ یہی ہمارا موضوع ہے، دوسرے عہدِ حاضر میں اردو زبان میں علم تفسیر پر جو کام ہوا ہے اس کی نظیر کسی اور زبان میں مشکل سے مل سکتی ہے۔

یومنون بالغیب کا مفہوم

سورۂ بقرہ کے بالکل شروع ہی میں یومنون بالغیب کا ذکر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الٓمّٓ ۔ ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْهِ	الم ۔ اس کتاب میں کچھ شک نہیں،
هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۔ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ	راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو جو کہ
بِالْغَیْبِ (بقرہ ۲: ۱-۳)	یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا[1]

عام طور پر مفسرین یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کا مفہوم یہ بتاتے ہیں کہ وہ امور و معتقدات جو حواس ظاہر سے ماوراء ہیں ان پر ایمان لاتے ہیں، مگر ابومسلم اصفہانی نے اس مفہوم کی نفی کرتے ہوئے اس پر درج ذیل اعتراضات کیے ہیں:

۱۔ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے بعد والی آیت میں اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ آیا ہے اور یہ آیت ماقبل آیت پر معطوف ہے، اور اس میں بھی ماوراء حواس ہی پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔ عربی زبان میں از روئے قاعدہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغایرت پائی جانی چاہیے اور یہ مغایرت یومنون بالغیب کی مروج تفسیر کی صورت میں نہیں پائی جاتی ہے۔

۲۔ یومنون بالغیب کے عموم میں ذات و صفات باری کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔

[1] آیتوں کے ترجمے شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کے ترجمہ قرآن سے ماخوذ ہیں۔

حالانکہ ازروئے اعتقاد یہ صحیح نہیں ہے۔

۳۔ ایمان علم کو مستلزم ہے۔ چنانچہ ایمان بالغیب کے مروج مفہوم کو اختیار کرنے کی صورت میں علم غیب کا اثبات لازم آتاہے اور قرآن مجید نے اس کی نفی کی ہے [1]

ایمان بالغیب کے عام مفہوم پر ابومسلم اصفہانی نے جو اشکالات کیے ہیں بعینہٖ اسی انداز کے اشکالات مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی اپنی تفسیر تدبر قرآن میں کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۔ "اس تفسیر کی صورت میں ایمان صرف غیب کے ساتھ مخصوص ہوکر رہ جاتاہے غیب کے سوا بقیہ ساری چیزیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے ایمان کے دائرہ سے باہر ہی رہ جاتی ہیں۔

۲۔ غیب کے اس مفہوم میں نبی اور کتاب پر اس کا اطلاق بہرحال نہیں ہوتا۔

۳۔ غیب اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے نہیں ہے۔ اس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ یہاں اللہ تعالیٰ بھی ایمان کے اجزاء میں شامل نہیں ہے۔

۴۔ غیب سے مراد اگر احوال آخرت ہیں تو اس کا ذکر آگے اسی سلسلہ میں مستقل طور پر آ ہی رہا ہے۔ وبالآخرۃ ھم یوقنون [2]"

امام رازی نے تفسیر کبیر میں جہاں ابومسلم کے مذکورہ بالا اشکالات نقل کیے ہیں وہیں انہوں نے جمہور مفسرین کی طرف سے اس کا دفاع بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۔ "یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ میں اجمالی طور پر ما وراء ادراک پر ایمان لانے کا ذکر ہے اور مابعد آیت میں بعض امور غیبیہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس صورت میں عطف تفصیل علی المجمل ہے اور یہ ازروئے قاعدہ درست ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

[1] ملتقط جامع التاویل لمحکم التنزیل ص ۱ [2] تفسیر تدبر قرآن ج ۱ ص ۹، مطبوعہ تاج کمپنی دہلی۔

وملائکته وجبریل ومیکال، ظاہر ہے کہ ملائکہ کے عموم میں حضرت جبرئیلؑ اور حضرت میکائیلؑ شامل ہیں مگر اس کے باوجود عطف کے ذریعہ ان کا ذکر اسی طور پر آیا ہے۔

۲۔ امور غیب کی دو قسمیں ہیں ۱۔ جن کی صراحت موجود ہے۔ ۲۔ جن کی صراحت نہیں ہے موخرالذکر کا علم محض اللہ تعالیٰ کو ہے۔ مگر جن کا صراحت موجود ہے ان پر علم کا اطلاق درست ہے۔

۳۔ لفظ غیب محض شاہد کی ضد کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا ہے۔ متکلمین کا ایک اصول یہ ہے۔

ھذا من باب الحاق الغائب بالشاھد — یہاں غائب کو شاہد سے ملحق کیا گیا ہے

اور اس سے انکی مراد ذات وصفاتِ الٰہی ہوتی ہے [1]"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمہور مفسرین سے علیحدہ ہوکر یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کی وہ کون سی تفسیر ہوسکتی ہے جس سے غیب کے مفہوم پر کیے گئے اشکالات کا ازالہ ہوسکے۔

مولانا اصلاحی نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"جو غیب میں رہتے ہوئے ایمان لاتے ہیں"

ان کا کہنا ہے کہ بالغیب میں ب ظرفیت کی ہے اور اس معنی کی متعدد مثالیں قرآن میں موجود ہیں [2]

مگر انہوں نے اس آیت کی تشریح میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اور عام مفسرین کے نقطہ نظر میں کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ صرف تعبیر کا فرق کہا جاسکتا ہے۔

[1] تفسیر کبیر ج ۱ ص ۲۵۰، ۲۵۱ [2] تدبر قرآن ج ۱ ص ۹۰۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ایمان لانے کے لیے وہ اس بات کے منتظر نہیں ہیں کہ تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں بلکہ وہ مشاہدہ کے بغیر محض عقل و فطرت کی شہادت اور پیغمبر کی دعوت کی بنا پر ان تمام چیزوں پر ایمان لاتے ہیں جن پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ سلف میں سے ربیع بن انس نے یہی تاویل اختیار کی ہے اور ہم نے بھی ترجمہ میں اسی کو ترجیح دی ہے۔"[1]

مذکورہ بالا اقتباس میں مولانا امین احسن اصلاحی نے بالغیب کو مومنین کی صفت تو بتایا ہے مگر امور غیبیہ کے تعلق سے ان کے نقطۂ نظر میں اور جمہور میں کوئی فرق نہیں ہے اس کے برخلاف ابومسلم اصفہانی نے اس آیت کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ عام مفسرین سے علٰحدہ بھی ہے اور اس سے اس کے بیان کردہ شکوک کا ازالہ بھی ہوجاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ان قولہ بالغیب صفۃ المومنین معناہ انہم یومنون باللہ حال الغیب کما یومنون بہ حال الحضور لا کالمنافقین[2]	بالغیب مومنین کی صفت ہے یعنی متقی وہ لوگ ہیں جو جلوت و خلوت میں یکساں ایمان رکھتے ہیں برعکس منافقین کے۔

ابومسلم نے اس مفہوم کی تائید میں قرآنی نظیر اور کلام عرب سے دلیل بھی پیش کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

"یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کی قرآنی نظیر لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے غیر موجودگی میں خیانت نہیں کی۔ اسی طرح محاورہ میں بولا جاتا ہے نعم الصدیق

[1] تدبر قرآن ج ۱ ص ۱۰۰۔ [2] ملتقط جامع التاویل ص ۱۔

لک فلان بظهر الغیب یعنی فلاں غیر موجودگی میں تمہارا کتنا عمدہ دوست ہے چنانچہ اس پوری آیت میں مومنین کی تعریف کی گئی ہے کہ ان کا ظاہر و باطن ایک ہے اور وہ منافقین سے الگ ہیں جو منہ سے کچھ کہتے ہیں اور دل میں کچھ رکھتے ہیں۔"[1]

علامہ ابن کثیر جو علمائے منقولات کے امام کا درجہ رکھتے ہیں انہوں نے بھی بعض مفسرین کے حوالے سے اس مفہوم کو نقل کیا ہے اور اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وقال بعضهم يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ كما يومنون بالشهادة وليسوا كما قال تعالىٰ عن المنافقين اذا لَقُوا الَّذِيْنَ قَالُوْا آمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيَاطِيْنِهِمْ قَالُوْا اِنَّا مَعَكُمْ وَاِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ۔ فعلى هذا يكون قوله بالغيب حالاً اى في حال كونهم غيباً عن الناس[2]	بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یومنون بالغیب سے مراد وہ لوگ ہیں جو غیر موجودگی میں بھی ویسا ہی ایمان رکھتے ہیں جیسا کہ سامنے اظہار کرتے ہیں اور وہ لوگ ایسے نہیں ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارہ میں کہا ہے کہ وہ لوگ جب اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو مومن ہیں اور جب اپنے شیاطین سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان سے تو ہم صرف مذاق کرتے ہیں۔ اس صورت میں بالغیب حال ہوگا یعنی لوگوں کی غیر موجودگی میں بھی

[1] ملتقط جامع التاویل ص ۲ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۱۔

ان کا یہ حال ہوتا ہے۔

جنت آدمؑ کی تفسیر سورۂ بقرہ میں حضرت آدمؑ اور ان کی اہلیہ حضرت حواؑ کو جنت میں آباد کیے جانے کا ذکر ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وَقُلْنَا یَا آدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُکَ الْجَنَّۃَ (بقرہ ۲: ۳۵)	اور ہم نے کہا اے آدم رہا کر تو اور تیری عورت جنت میں۔

مفسرین اس بارہ میں مختلف الرائے ہیں کہ اس آیت میں الجنۃ سے مراد وہی مخصوص جنت سماوی ہے جس میں آخرت میں نیک بندے جائیں گے یا اس سے جنت ارضی مقصود ہے۔ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وقد اختلف فی الجنۃ التی اسکنہا آدم اھی فی السماء او فی الارض فالاکثرون علی الاول وحکی القرطبی عن المعتزلۃ والقدریۃ بانہا فی الارض [1]	وہ جنت جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو بسایا اس کے بارہ میں اختلاف ہے کہ اس سے جنت سماوی مراد ہے یا جنت ارضی۔ قرطبی کا بیان ہے کہ معتزلہ اور قدریہ جنت ارضی کے قائل ہیں

ابومسلم اصفہانی نے موخرالذکر قول کو ترجیح دی ہے، اس صورت میں اشکال یہ پیش آتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو جب جنت سے نکالا گیا تو اس کے لیے لفظ اھباط استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی نیچے جانے کے ہوتے ہیں اس کی توجیہ کیا ہوگی؟ ابومسلم نے اس اشکال کا جواب یوں دیا ہے:

الاھباط الانتقال من بقعۃ	لفظ اھباط ایک جگہ سے دوسری جگہ

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۷۰۔

الی بقعۃ کما فی قولہ تعالیٰ اِھْبِطُوْا مِصْرًا [1]	منتقل ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِھْبِطُوْا مِصْرًا یعنی مصر چلے جاؤ۔

ابومسلم اصفہانی کا کہنا ہے کہ جنت سماوی مراد لینے کی صورت میں درج ذیل اشکالات پیش آتے ہیں۔

۱۔ جنت سماوی کی صفت خلود بتائی گئی ہے اس میں ابلیس کا یہ کہہ کر حضرت آدمؑ کو بہکانا کہ آؤ میں تم کو ہمیشگی کے درخت کا پتہ بتاؤں اور یہ کہ اس درخت سے لطف اندوز ہوکر تمہیں ہمیشگی حاصل ہوجائے گی، بے معنی بات ہوجاتی ہے۔

۲۔ جنت سماوی کا خاصہ یہ بتایا گیا ہے کہ جو شخص اس میں داخل کیا جائے گا اس کو کبھی اس سے نکالا نہیں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا ھُمْ مِنْھَا بِمُخْرَجِیْنَ۔	وہ لوگ اس سے نکالے نہیں جائیں گے

۳۔ حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کرکے جب ابلیس بارگاہِ خداوندی میں معتوب ہوچکا تھا تو پھر جنت تک اس کی رسائی کیسے ہوگئی؟

۴۔ جنت کی حصولیابی بطور جزا بتائی گئی ہے۔ تکلیف و عمل سے پہلے ہی اس کا حاصل ہونا کیسے ممکن ہے۔

۵۔ حضرت آدمؑ کی تخلیق روئے زمین کے لیے ہوئی تھی (اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً) ان کی آسمان پر منتقلی کی کوئی صراحت قرآن مجید میں مذکور نہیں ہے جبکہ یہ خود ایک بڑا انعام ہے۔ [2]

[1] ملتقط جامع التاویل ص ۲ [2] ایضاً ص ۲، ۳۔

امام آلوسی نے ابومسلم کے یہ اشکالات اپنی تفسیر میں نقل کرکے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ یہ دین کے ساتھ مذاق اور اجماع امت سے بغاوت ہے[1] مگر علامہ ابن کثیر نے اس مسئلہ کو اہمیت دی ہے اور بعض اشکالات کے جواب بھی دیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ابلیس پر جنت میں باعزت داخلہ کی پابندی تھی، چوری چھپے اور ذلت کے ساتھ اس کا داخلہ ممکن تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے جنت کے باہر سے حضرت آدمؑ و حواؑ کے دلوں میں وسوسہ پیدا کیا ہو، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کی وسوسہ اندازی زمین سے تھی اور وہ دونوں آسمان میں تھے۔"[2]

مولانا عبدالماجد دریابادی نے بھی ابومسلم کے اشکال کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جنت اس وقت تک دارالجزا یا دارالخلد نہ تھی بلکہ اس وقت وہاں کے قیام کے کچھ مخصوص قوانین تھے۔ شرائط تھے اور جب جنت کی ماہیت اس وقت یہ تھی تو کوئی اشکال نہیں رہتا وہاں وسوسۂ شیطانی پہنچ جانے پر یا کسی متنفس کے وہاں سے نکالے جانے پر۔"[3]

کاش مولانا دریابادی نے یہ وضاحت فرمادی ہوتی کہ اس وقت جنت میں قیام کے مخصوص قوانین و شرائط کیا تھے اور جنت کی ماہیت میں تبدیلی کب عمل میں آئی تو یقیناً ابومسلم کے اشکال کا یہ مدلل جواب ہوتا۔

واقعہ ہاروت و ماروت سورۂ بقرہ کی درج ذیل آیت میں ہاروت و ماروت نام کے دو فرشتوں کا واقعہ بیان ہوا ہے۔

۱؎ روح المعانی ج ۱ ص ۳۴۹ ۲؎ تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۸۱ ۳؎ تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۸۷۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ (البقرہ: ۱۰۲)

اور پیچھے ہو لیے اس علم کے جو پڑھتے تھے شیطان سلیمان کی بادشاہت کے وقت اور کفر نہیں کیا سلیمان نے لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ سکھلاتے تھے لوگوں کو جادو اور جو اترا دو فرشتوں پر شہر بابل میں جن کا نام ہاروت و ماروت ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین متفق الرائے ہیں کہ ہاروت و ماروت دو فرشتے تھے اور ان پر سحر یا اسی انداز کی کوئی چیز اتاری گئی تھی اور وہ لوگوں کو اس کی تعلیم دیتے تھے، مگر ابومسلم اصفہانی نے اس عام خیال سے اتفاق نہیں کیا ہے اور اس کے لیے درج ذیل دلائل پیش کیے ہیں:

۱۔ جس چیز کا نزول ہوا اس کا نازل کرنے والا اللہ ہے۔ سحر جیسے کفریہ عمل کو وہ کیسے نازل کرسکتا ہے۔

۲۔ تعلیم سحر شیاطین کا خاصہ ہے۔ ملائکہ اس سے منزہ ہیں۔

۳۔ جب انبیائے کرام تعلیم سحر کے لیے نہیں بھیجے جاسکتے تو ملائکہ بدرجۂ اولیٰ اس غرض کے لیے مامور نہیں کیے جاسکتے ہیں۔[1]

بعینہ یہی اشکال مولانا امین احسن اصلاحی کو بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان فرشتوں پر کیا چیز اتاری گئی، اس سوال کا

۱؎ ملتقط جامع التاویل ص ۸۔

جواب عام طور پر مفسرین نے یہ دیا ہے کہ یہ جادو کا علم ہے، لیکن یہ جواب کئی پہلوؤں سے کھٹکتا ہے۔

۱۔ معطوف و معطوف علیہ میں عام اصول کے مطابق ایک حد تک مغایرت ہونی چاہیے وہ نہیں پائی جاتی۔

۲۔ اس کے لیے انزل کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا واضح مفہوم یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ علم اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا تھا۔ اس لفظ میں عنایت اور افادیت کی جو شان ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے سحر جیسی شیطانی ناپاک اور سراسر باطل بلکہ کفریہ چیز کے لیے اس کا استعمال ذوق پر گراں گزرتا ہے۔۔۔۔

۳۔ فرشتے ہمیشہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و عدل کے قیام اور خیر و فلاح کی دعوت و تعلیم کا ذریعہ بنے ہیں اور یہی چیز ان کے شایان شان ہے اس وجہ سے جادو کے علم کا ان پر اترنا اور ان کا اس کی اشاعت کرنا اگرچہ کتنی احتیاط کے ساتھ کیوں نہ ہو، عقل سے بعید بات ہے"۔[1]

متقدمین میں علامہ ابن جریر طبری نے اس اشکال کا حل تلاش کیا ہے کہ "ما اُنزِلَ علی الملکین" میں "ما" کو نافیہ بتایا ہے یعنی دونوں فرشتوں پر سحر نہیں اترا، البتہ ہاروت و ماروت نام کے دو آدمی تھے جو سحر کی تعلیم دیتے تھے۔

علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں گو ابن جریر کی یہ تاویل نقل کی ہے مگر جمہور کا مسلک یہی بتایا ہے کہ ہاروت و ماروت دو فرشتوں کا نام تھا جو آسمان سے زمین پر بھیجے گئے تھے۔ اور تعلیم سحر کی جو بات ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے وہ درست ہے۔[2]

[1] تدبر قرآن ج ۱ ص ۲۸۳، ۲۸۴ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۳۰۔

رہا یہ اشکال کہ تعلیم سحر ملائکہ کی شان کے منافی ہے اس کی توجیہ علامہ ابن کثیر نے یہ کی ہے:

فیکون الجمع بین ھذا وبین ما ورد من الدلائل علی عصمة الملائکة ان ھذین سبق فی علم اللہ فیکون تخصیصاً لھما۔[1]	ہاروت و ماروت کے واقعہ تعلیم سحر اور عام ملائکہ کا اس سے مبرا ہونا کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ان دونوں فرشتوں کے بارہ میں اللہ کو پہلے سے علم تھا کہ وہ ایسا کر بیٹھیں گے تو یہ صورت ان کے لیے تخصیص کے درجہ میں ہے۔

جمہور کی رائے کی تائید میں علامہ ابن کثیر نے قاسم کا یہ قول بھی پیش کیا ہے:

قال فی ھذہ القصة لا ابالی ای ذلک کان انی آمنت بہ[2]	یہ واقعہ خواہ کیسا بھی ہو مجھ کو اس سے غرض نہیں۔ میں اس پر یقین کرتا ہوں۔

متاخرین مفسرین میں مولانا عبدالماجد دریابادی جمہور کے مسلک کی تائید میں یہ توجیہ کرتے ہیں:

۱۔ نزل و انزال کا اطلاق صرف احکام تشریعی میں نہیں ہوتا، امور تکوینی میں بھی برابر ہوتا رہتا ہے۔

۲۔ تکوینیات کے سلسلہ میں جو کام گندے سے گندا بھی کیا جاتا ہے اس کے لیے واسطہ اور وسیلہ بہرحال فرشتے ہی ہوتے ہیں اور یہ امر ان کی نزاہت و معصومیت کے ذرا بھی منافی نہیں ہے۔[3]

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۳۰ [2] ایضاً [3] تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۱۷۹۔

مگر مولانا دریابادی کی اس تاویل کو مولانا امین احسن اصلاحی نے یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ:

"ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں کہ خیر ہو یا شر دنیا میں جو چیز بھی پائی جاتی ہے خدا کی مشیت ہی کے تحت پائی جاتی ہے، لیکن خدا کی مشیت کے تحت کسی باطل کو مہلت ملنا اور چیز ہے اور سحر جیسے شیطانی علم کا دو فرشتوں پر اتارا جانا بالکل دوسری چیز ہے۔"[1]

سوال یہ ہے کہ آخر وَمَا اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ کی وہ کون سی تاویل مناسب ہوگی جس سے خداوند تعالیٰ کو بھی انزال سحر سے بری قرار دیا جا سکے اور ملائکہ قدسی بھی تعلیم سحر کے الزام سے بچ جائیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے اشکال کی حد تک تو ابومسلم کا ساتھ دیا ہے مگر اس کو دفع کرنے کے سلسلہ میں ان کا نقطہ نظر ابومسلم سے علیحدہ ہے اور کسی حد تک جمہور ہی کی تائید کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہمارے نزدیک اس سے مراد اشیاء اور کلمات کے روحانی خواص و تاثیرات کا وہ علم ہے جس کا رواج یہود کے صوفیوں اور پیروؤں میں ہوا اور جس کو انہوں نے گنڈوں تعویذوں اور مختلف قسم کے عملیات کی شکل میں مختلف اغراض کے لیے استعمال کیا۔"[2]

مولانا اصلاحی کی اس تاویل کے مطابق انزال سحر و تعلیم سحر کا اشکال تو بظاہر حل ہو جاتا ہے مگر اشیاء اور کلمات کے روحانی خواص و تاثیرات کے علم کا منجانب اللہ نازل کیا جانا اور ملائکہ کے ذریعہ اس کی تعلیم دینا ثابت ہوتا ہے، حالانکہ اس کو وہ خود تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ الفلق کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں:

۱؎ تدبر قرآن ج ۱ ص ۲۸۴ ۲؎ ایضاً ص ۲۸۵۔

"گرہوں میں پھونک مارنے کا یہ طریقہ ٹونے ٹوٹکے اور گنڈے کا عمل کرنے والے اختیار کرتے ہیں، ... اس صفت (نفاثات فی العقد) سے ان کا ذکر کرنے سے مقصد ان کے عمل کی تصویر کھینچنا ہے۔ ... میرے نزدیک اس سے مقصود اس چیز کی لغویت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔"[1]

مدرسۃ الاصلاح کے ایک دوسرے فاضل مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے وَمَا اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ کی تفسیر نہایت عمدہ کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ہمارے خیال میں شیاطین کے علوم سفلیہ کے مقابلہ میں یہاں علوم علویہ مراد ہیں۔"[2]

مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا یہ بھی کہنا ہے کہ نظم کلام کا اقتضاء ہے کہ یہاں علوم سفلیہ ہی کو ماننے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ علوم علویہ کو بھی مراد لیا جائے۔[3]

حیرت ہے کہ مولانا اصلاحی نے غالباً مولانا امین احسن اصلاحی کے تتبع میں علوم علویہ کی تشریح دعا اور تعویذ سے کی ہے[4] جبکہ خود موصوف نے تعویذ اور گنڈے کو گھناؤنا کام لکھا ہے۔[5]

آیت زیر بحث میں ابومسلم اصفہانی نے بھی علوم علویہ ہی کو مراد لیا ہے اور اس کی تعبیر شریعت، دین اور دعوت الی الخیر سے کی ہے اور ظاہر ہے کہ ان اشیاء کے علوم علویہ ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا ہے۔

ابومسلم نے اس آیت کی تفسیر یوں کی ہے:

"تتلو الشیاطین یعنی شیاطین حضرت سلیمانؑ کے متعلق جھوٹ بولتے تھے تتلا علیہ

۱؎ تدبر قرآن ج ۹ ص ۶۶۳ ۲؎ ایضاح القرآن ص ۱۲۰ ۳؎ ایضاً ص ۱۲۱ ۴؎ ایضاً ص ۱۲۰
۵؎ ایضاً ص ۱۱۵۔

کے معنی جھوٹ بولنے کے ہوتے ہیں اور تلا عند کے معنی کسی کے متعلق سچ کہنے کے آتے ہیں اور جب کوئی صلہ نہ ہو تو دونوں ہی معنی لیے جا سکتے ہیں۔ آیت میں وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ ملک سلیمان پر معطوف ہو کر مجرور ہے، یعنی یہود اس کذب کی پیروی کرتے ہیں جس کو شیاطین نے ملک سلیمان اور ہاروت و ماروت پر نازل کیے گئے علم کی طرف غلط طور سے منسوب کر دیا ہے۔[1]

امام رازی نے ابومسلم کی اس تاویل پر گو یہ اعتراض کیا ہے کہ وَمَاۤ اُنْزِلَ کا عطف اقرب کی طرف لوٹانا زیادہ موزوں ہے تاہم انہوں نے اس تاویل پر ابومسلم کی تحسین کی ہے جس کا اندازہ اس موقع پر ان کے اس دعائیہ جملہ سے کیا جا سکتا ہے۔

وهو اختيار ابي مسلم رحمه الله[2]

یہ ابومسلم رحمۃ اللہ علیہ کی اختیار کردہ تاویل ہے۔

ابومسلم اصفہانی کی اس تاویل پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ دونوں فرشتوں کا یہ کہنا کہ ہم فتنہ ہیں اور قرآن مجید کی یہ صراحت کہ لوگ ان سے افتراق زوجین کا علم سیکھتے تھے اس کی توجیہ کیا ہوگی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے مسلک جمہور کی حمایت کے باوجود اس موقع پر یہ لطیف نکتہ تحریر فرمایا ہے کہ:

"فسق پیشہ اور معصیت دوست لوگ سحر سیکھ ہی جاتے، ملائکہ کی نیت کا بخیر ہونا بالکل ظاہر ہے"[3]

مگر ابومسلم اصفہانی نے اس لطیف نکتہ کی گرہ کشائی بڑے خوب صورت انداز میں کی ہے۔

---

[1] ملتقط جامع التاویل ص ۸، [2] تفسیر کبیر ج ۱ ص ۶۴۹، [3] تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۱۸۴۔

وہ لکھتے ہیں:

قولهما انما نحن فتنة فلا تكفر توكيداً لبعثهم على القبول والتمسك وكانت طائفة تتمسك واخرى تخالف وتعدل عن ذلك ويتعلمون منهما اى من الفتنة والكفر مقدار ما يفرقون به بين المرء وزوجه[1]

ان دونوں فرشتوں کا یہ کہنا کہ ہم آزمائش کی چیز ہیں ہمارا انکار مت کرو درحقیقت اپنی بعثت کا تاکیدی اظہار ہے۔ ایک طبقہ ان کا متبع تھا اور دوسرا منحرف تھا (جیسا کہ عام عادت ہے) چنانچہ منحرف طبقہ فتنہ و کفر میں مبتلا ہو کر (منهما میں هما کا مرجع فتنہ و کفر ہے) سحر کا علم اسی حد تک حاصل کرتا تھا جس سے وہ زوجین میں تفریق پیدا کر دے۔

امام شوکانی نے بھی بعض علماء کی یہ رائے نقل کی ہے کہ آیتِ زیرِ بحث میں ساحر کے نقصان پہونچانے کی صلاحیت کی آخری حد بیان ہوئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وقد ذهبت طائفة من العلماء الى ان الساحر لا يقدر على اكثر مما اخبر الله به من التفرقة۔[2]

علماء کی ایک جماعت کا یہ کہنا ہے کہ جادوگر کو اس سے زیادہ کی صلاحیت نہیں دی گئی ہے جتنی کہ اللہ نے آیت میں بتائی ہے۔

نسخ کا مفہوم | مفسرین کا عام اتفاق ہے کہ قرآن مجید کی کچھ آیتیں ناسخ اور کچھ منسوخ ہیں۔

---

[1] ملتقط جامع التاویل ص ۹، [2] فتح القدیر ج ۱ ص ۱۲۰۔

البتہ ناسخ و منسوخ آیتوں کی تعیین میں ان کے مابین اختلاف ہے۔ سورۂ بقرہ کی درج ذیل آیت سے نسخ پر استدلال کیا جاتا ہے۔

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا فَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا۔ (بقرہ: ۱۰۶)

جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو بھیج دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت میں لفظ آیت سے تمام مفسرین نے قرآن مجید ہی کی آیت مراد لی ہے۔ صرف ابو مسلم اصفہانی اس کے مخالف ہیں۔[1] ابو مسلم کا کہنا ہے کہ اس آیت میں نسخ آیت کا مطلب کتب قدیمہ کی آیات کی تبدیلی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

المراد من الآیات المنسوخة هی الشرائع التی فی الکتب القدیمة من التوراة والانجیل کالسبت والصلوٰة الی المشرق والمغرب مما وضعه الله عنا وتعبدنا بغیره فان الیهود والنصاریٰ کانوا یقولون لا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم فابطل الله علیهم ذلک بهذه الآیة[2]

منسوخ آیتوں سے مراد قدیم آسمانی کتابوں یعنی تورات و انجیل کے احکام کی منسوخی ہے، جیسے سبت کی اہمیت یا مشرق و مغرب کی جانب رخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ احکام ہم سے ساقط کر دیے اور ہم کو دوسرا طریقہ عبادت بتایا چونکہ یہود و نصاریٰ آپس میں کہتے تھے کہ صرف اس شخص کی بات مانو جو تمہارے دین کے مطابق عمل کرتا ہو

[1] تفسیر کبیر ج ۱ ص ۶۶۲ [2] ملتقط جامع التاویل ص ۹۔

تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر ان کی تردید کی کہ اس دین کے احکام پچھلے دین جیسے یا اس سے بہتر ہیں۔

علامہ ابوبکر الجصاص نے ابو مسلم کی اس تاویل کو توفیق الٰہی سے بعید بتایا ہے اور اس پر یہ کہہ کر نکیر کی ہے کہ متقدمین میں کسی نے یہ تاویل اختیار نہیں کی ہے[1]

مگر علامہ ابن کثیر نے یہ تسلیم کیا ہے کہ سورۂ بقرہ کی زیر بحث آیت میں مخاطب یہود ہیں چنانچہ انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں جمہور کے مسلک کے ساتھ ابو مسلم کے نقطۂ نظر کو بھی سمیٹ لیا ہے، لکھتے ہیں:

انه قد وقع ذلک فی کتبه المتقدمة وشرائعه الماضیة ففی هذا المقام بین تعالیٰ جواز النسخ رداً علی الیهود علیهم لعنة الله[2]

چونکہ نسخ پچھلی کتابوں اور شریعتوں میں بھی ہو چکا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بھی اس کے پائے جانے کو اس موقع پر بیان فرمایا اور اس سے یہود کی تردید مقصود ہے۔

گو متاخرین مفسرین نسخ کے بارہ میں ابو مسلم کے نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہیں، مگر اس آیت کی وہی تاویل کی ہے جو ابو مسلم نے کی ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں:

"اس آیت میں نسخ آیات سے مقصود پچھلی شریعتوں کا نسخ ہے یا خود قرآن کے بعض احکام و آیات کا؟ اس بارے میں مفسرین کے دونوں قول موجود ہیں، ہم نے پہلی

[1] احکام القرآن ج ۱ ص ۵۹ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۵۱۔

صورت اختیار کی کیونکہ ہمارے خیال میں یہ سیاق وسباق سے زیادہ مربوط ہے۔[1]

مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی اسی سے اتفاق ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سورۂ بقرہ کی زیر بحث آیت کا تعلق تمام تر دریان سابقہ سے ہے اور اس میں جس نسخ کا حوالہ ہے اس کی ضرورت اور اس کی حکمت اس قدر واضح ہے کہ کسی انصاف پسند کے لیے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔"[2]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا ہے اور اس پر نہایت تفصیل سے یہ لکھا ہے:

"یہ ایک خاص شبہ کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں خدا کی طرف سے آئی تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے تو ان کے بعض احکام کی جگہ یہ دوسرے احکام کیوں دیے گئے ہیں۔ ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف وقتوں میں مختلف احکام کیسے ہو سکتے ہیں۔ پھر تمہارا قرآن یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہودی اور عیسائی اس تعلیم کے ایک حصے کو بھول گئے جو انہیں دی گئی تھی۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی تعلیم اور وہ حافظوں سے محو ہو جائے۔ یہ ساری باتیں تحقیق کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے کرتے تھے کہ مسلمانوں کو قرآن کے من جانب اللہ ہونے میں شک ہو جائے۔ اسکے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں مالک ہوں، میرے اختیارات غیر محدود ہیں، اپنے جس حکم کو چاہوں منسوخ کردوں اور جس چیز کو چاہوں حافظوں سے محو کردوں مگر جس چیز کو میں منسوخ یا محو کرتا ہوں اس سے بہتر چیز اس کی جگہ پر لاتا ہوں یا کم از کم وہ اپنے محل میں اتنی ہی مفید اور مناسب ہوتی ہے جتنی پہلی چیز اپنے محل میں تھی۔"[3]

(باقی)

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۱۲۵، ۱۲۶۔ [2] سابقہ اکیڈمی تدبر قرآن ج ۱ ص ۲۱۳۔ [3] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۰۱، ۱۰۲۔

سائنس میں مسلمانوں کا عروج وزوال

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی، بنگلور

موجودہ دور میں سائنس اور ٹکنالوجی کی بے مثال ترقی نے پورے انسانی معاشرے کا احاطہ کرلیا ہے۔ آج ہماری انفرادی واجتماعی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہ گیا ہے جو ان کے اثرات سے خالی ہو۔ مختلف میدانوں میں صنعت وحرفت کی ترقی کے باعث پوری دنیا سکڑ کر ایک چھوٹے سے شہر کی طرح بن گئی ہے اور مختلف ممالک اس شہر کے محلوں کی طرح نظر آرہے ہیں۔ چنانچہ پوری دنیا ٹیلی فون، ٹیلی پرنٹر، فیکس، ریڈیو، ٹی وی اور کمپیوٹر (انٹرنیٹ) وغیرہ کے ذریعہ اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر پوری دنیا کی سیر کرسکتے ہیں اور آن کی آن میں کسی بھی ملک یا دنیا کے کسی بھی شہر سے رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ گویا کہ سارا جہاں ہماری مٹھی میں ہے۔

معاشرے پر زوال ملت کے اثرات مختلف سائنسی علوم کی ترقی کی بدولت آج دنیا میں ہزاروں لاکھوں صنعتیں کام کر رہی ہیں اور موجودہ انسان برق وبخارات، شمسی توانائی اور جوہری طاقت کو مسخر کرکے سمندروں پر اپنی سیادت قائم کرچکا ہے، زمینی خزانوں کا مالک بن چکا ہے اور فضا وخلا پر حکمرانی کر رہا ہے گویا کہ وہ پوری کائنات پر قابض ہوچکا ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں یورپ اور امریکہ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں زبردست ترقی کرکے اقوام عالم پر چھاگئے اور انہوں نے ان علوم سے تہی مایہ قوموں کو

اپنا غلام اور حاشیہ بردار بنالیا۔ مشرقی اقوام اور خاص کر ملت اسلامیہ کی غفلت اور کوتاہی کے باعث عالم اسلام اس میدان میں پیچھے رہ گیا اور اس کے منفی اثرات ہمارے معاشرے اور خاص کر ہمارے نوجوانوں پر بھی پڑے اور ان میں بددلی اور قنوطیت نے جنم لیا، بلکہ اس کے نتیجے میں دین و مذہب سے برگشتگی بھی عمل میں آئی۔ کیونکہ آج دنیا کی تمام قومیں بشمول مسلمان مغرب کی اس متاثر کن مادی ترقی کی وجہ سے مغربی فلسفوں اور اس کے طرز زندگی سے متاثر و مسحور ہو چکے ہیں اور اپنے دین و مذہب کو استخفاف کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ عالم اسلام کے لیے ایک سنگین مسئلہ اور موجودہ دور کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ بطور علاج اس کے اسباب و محرکات کا جائزہ لے کر اس صورت حال کو بدلا جائے جو آج اسلام جیسے دین ابدی پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ ورنہ مسلم معاشرہ اور خاص کر مسلم نوجوانوں کا اپنے دین و ایمان پر اعتماد بحال نہ ہو سکے گا بلکہ دین سے ان کی دوری مزید بڑھتی جائے گی۔

سائنس کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ

واقعہ یہ ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں مغربی ممالک کی پیش قدمی اچانک اور راتوں رات نہیں ہو گئی بلکہ یہ ایک طویل تاریخی عمل کا نتیجہ ہے اور اس عمل میں دنیا کی مختلف قوموں اور خاص کر مسلمانوں کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ چنانچہ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ قرون وسطیٰ میں اہل اسلام نے مختلف سائنسی میدانوں میں ترقی کر کے جدید سائنس کی داغ بیل ڈالی تھی اور اس راہ میں صدیوں کے مسلسل تجربات کے بعد جدید علوم و فنون کی جو بنیادیں ڈالی تھیں انہی بنیادوں پر مغربی قوموں نے اپنی عمارت کھڑی کی۔ ظہور اسلام سے پہلے یونانیوں، رومیوں، کلدانیوں، بابلیوں اور اہل ہند وغیرہ کا جو کچھ علمی سرمایہ تھا وہ محض ظن و تخمین اور نظریات و مفروضات کا مجموعہ تھا۔

جب کہ اس کے برعکس اہل اسلام نے تجرباتی سائنس کی بنیاد ڈال کر مختلف علوم و فنون اور خاص کر حساب، الجبرا، جغرافیہ، طب، نباتیات، حیوانیات، فلکیات، طبیعیات اور کیمیا وغیرہ (تمام سائنسی علوم) کو خوب ترقی دی۔ چنانچہ ان علوم میں مسلمانوں کے تقدم اور ان کی اولیت کے خود بہت سے مغربی فضلاء معترف ہیں، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

قرآن عظیم کا تاریخی رول

اور اس سلسلے میں دوسری حقیقت یہ ہے کہ سائنسی علوم کے میدان میں اہل اسلام کو آگے بڑھانے کا بنیادی محرک خود قرآن عظیم ہے جس نے اپنے دینی و شرعی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے اہل اسلام کو مظاہر کائنات میں غور و فکر اور ان کی جانچ پڑتال کرنے اور ان کے نظاموں کے اندر ودیعت شدہ اسباب و علل کا پتہ لگانے کی مختلف اسالیب اور پُرزور انداز میں دعوت دی تھی۔ چنانچہ بطور مثال چند آیات ملاحظہ ہوں:

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (یونس: ۱۰۱)

کہدو کہ ذرا غور سے دیکھو تو سہی کہ زمین اور آسمانوں (اجرام سماوی) میں کیا کیا چیزیں موجود ہیں!

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ: (عنکبوت: ۲۰)

کہدو کہ تم لوگ زمین میں چل پھر کر (اچھی طرح) مشاہدہ کر لو کہ (خلاق عالم نے) مخلوق کو اولاً کس طرح پیدا کیا؟ پھر اللہ دوسری مرتبہ بھی اسی طرح پیدا کرے گا۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ. وَاِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ

کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ انکی خلقت کس طرح (عجیب و غریب طور پر)

وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ. وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ.

(غاشیہ: ۱۷-۲۰)

بنائی گئی ہے؟ اور آسمان کس طرح اونچا اٹھایا گیا ہے؟ پہاڑ کس طرح (زمین میں مضبوطی کے ساتھ) دھنسائے گئے ہیں؟ اور زمین کس طرح (اسکی پوری گولائی میں) پھیلا دی گئی ہے؟

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ.

(ق: ۶)

تو کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر موجود آسمان کو غور سے نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کس طرح بنایا اور آراستہ کیا ہے؟ چنانچہ اس میں کسی قسم کا شگاف نہیں ہے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِى السَّمَاءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ.

(حجر: ۶)

اور ہم نے آسمان میں یقیناً بہت سے بروج (ستاروں کے جھرمٹ اور کہکشائیں) بنادی ہیں۔ اور انہیں غور سے دیکھنے والوں کے لیے مزین کر دیا ہے۔

اُنْظُرُوْا اِلٰى ثَمَرِهٖ اِذَا اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ. (انعام: ۹۹)

(پیڑ پودوں کے) پھل کو غور سے دیکھو جب وہ پھل لانے اور پکنے لگتا ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ

(عبس: ۲۴)

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی غذا کا مشاہدہ کرے (کہ وہ مختلف طبیعی قوتوں کی کارفرمائی کے باعث کس طرح اس کے ہاتھوں تک پہنچتی ہے؟)

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ. خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ.

(طارق: ۵-۶)

انسان کو نظر ڈالنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ وہ ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔

یہ اور اس قسم کی دیگر آیات سے یہ حقیقت پوری طرح روشنی میں آجاتی ہے کہ قرآن حکیم نے انسان کو اس کائنات کی ایک ایک چیز اور ایک ایک منظر فطرت کا دقتِ نظر سے جائزہ لینے اور ان کے نظاموں کی چھان بین کرنے کی تاکید کی ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ تجرباتی سائنس کی اولین بنیاد رویت و مشاہدہ میں ہے اور اس لحاظ سے قرآنِ عظیم روئے زمین پر تجرباتی سائنس کا اولین داعی و علمبردار قرار پاتا ہے۔

اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ اوپر مذکور تمام آیات میں لفظ "نظر" مختلف حیثیتوں سے استعمال کیا گیا ہے اور اس کے معنی محض خالی خولی دیکھنے یا "ایک نظر" ڈال لینے کے نہیں، بلکہ ماہرین لغت اور ائمۂ تفسیر کی تصریح کے مطابق غور و فکر کرنے نظر بصیرت ڈالنے اور کسی چیز کا جائزہ لینے کے ہیں۔

(قال) الجوهري: النظر تأمل الشئ بالعين[1]

جوہری نے کہا ہے کہ نظر کے معنی آنکھ کے ذریعہ کسی چیز میں غور کرنا ہے۔

امام راغب اصفہانی تحریر کرتے ہیں:

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، اى تأملوا[2]

یعنی انظروا کے معنی غور و فکر کرنے کے ہیں۔

---

[1] لسان العرب، ابن منظور، ۵/۲۱۵، دار صادر بیروت [2] المفردات فی غریب القرآن ص ۵۱۹، بیروت۔

اور علامہ زمخشری "انظروا الی ثمرہ اذا اثمر و ینعہ" (انعام: ۹۹) کی تفسیر میں تحریر کرتے ہیں: نظر اعتبار و استبصار و استدلال۔ یعنی اس مظہر ربوبیت کو عبرت وبصیرت اور استدلال کی نظر سے دیکھو[1]۔

نیز اس سلسلے میں امام غزالی تحریر کرتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے عقلوں کو پیدا کیا اور اپنی ہدایت کو وحی کے ذریعہ کامل کر دیا اور ارباب دانش کو اپنی مخلوقات پر نظر ڈالنے کی ہدایت کی اور ان میں ودیعت شدہ عجائب میں غور کرنے اور ان سے عبرت حاصل کرنے پر زور دیا، جیسا کہ ارشاد ہے (کہدو کہ زمین اور آسمانوں میں جو چیزیں موجود ہیں انہیں غور سے دیکھو) نیز ارشاد ہے (اور ہم نے پانی ہی سے ہر زندہ چیز پیدا کی ہے تو کیا وہ ایمان نہیں لائیں گے؟) اس قسم کی اور بھی بہت سی واضح آیتیں اور بین دلیلیں موجود ہیں[2]۔

اور اس سلسلے میں علامہ قزوینی نے اس مسئلے کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ اس طرح تحریر کیا ہے: "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نظر نہیں ڈالی کہ ہم نے اسے کس طرح بنایا اور اسے کس طرح مزین کر رکھا ہے؛ چنانچہ اس میں کوئی شگاف نہیں ہے) تو اس موقع پر "نظر" سے مراد محض دیدے پھرانا نہیں ہے کیونکہ اس صفت میں چوپائے بھی انسان کے شریک ہیں۔ لہذا جس نے آسمان میں سوائے نیلاہٹ کے اور زمین میں سوائے گرد و غبار کے اور کچھ نہیں دیکھا تو وہ چوپاؤں میں شریک کیے جانے کے قابل بلکہ ان سے زیادہ گیا گزرا اور غافل شخص ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے؛ (ان کے دل تو ہیں مگر وہ ان سے سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں تو ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔

[1] تفسیر کشاف: ۲/۴۰، طہران [2] الحکمۃ فی مخلوقات اللہ، از امام غزالی، ص ۱۴، مطبوعہ بیروت ۱۹۷۸ء

ان کے کان تو ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں، لہذا وہ چوپاؤں کی طرح نہیں بلکہ ان سے زیادہ گمراہ اور یہی لوگ غافل ہیں)۔ غرض اس موقع پر نظر سے مراد معقولات میں تفکر، محسوسات میں غور و فکر اور ان کی حکمتوں میں بحث ہے تاکہ مخلوقات و موجودات الٰہی کے حقائق ظاہر ہو جائیں[1]۔

قرآنی دعوت فکر اور دلائل ربوبیت

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نے نظام کائنات میں چھان بین کر کے اس کے اندر موجود حقائق یا اسباب و علل کا پتہ لگانے کی تاکید کیوں کی ہے اور اس دعوت فکر کے مقاصد کیا ہیں؟ تو اس کے دو بنیادی مقاصد نظر آتے ہیں: پہلا مقصد یہ ہے کہ مظاہر فطرت کے منظم مطالعہ سے ان میں ودیعت شدہ خدائی دلائل (آیات الٰہی) خود انسانی تحقیق کے ذریعہ منکشف ہو جائیں، تاکہ منکرین حق کو انکار خدا کی گنجائش باقی نہ رہ جائے، بلکہ ان پر موثر طریقے سے خدا کی حجت پوری ہو جائے۔

خدائی دلائل سے مراد خدا کی توحید، اس کی خلاقیت اور اس کی ربوبیت و الوہیت کے وہ آثار (نشانیاں) ہیں جو اشیائے عالم میں غور و خوض اور تحقیق و تفتیش کے باعث ان کے منطقی نتائج کے طور پر سامنے آتے ہیں اور ان دلائل و براہین کے ذریعہ شرک و مظاہر پرستی اور الحاد و لادینیت کے علاوہ ان تمام مادی فلسفوں کا رد و ابطال ہوتا ہے جو آج عالم انسانی کو گھیرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	زمین اور آسمانوں کی خلقت و ہیئت
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ	میں، دن رات کے ادل بدل میں،
الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ	ان جہازوں میں جو سمندر میں لوگوں
وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ	کے لیے فائدہ مند چیزیں لے کر چلتے ہیں

[1] عجائب المخلوقات، از زکریا بن محمد القزوینی، ص ۸، المکتبۃ الاموية۔

فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ (بقرہ: ۱۶۴)

اس پانی میں جسے اللہ نے آسمانی بلندی سے نازل کیا اور اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کر دیا اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے، ہواؤں کے ہیر پھیر میں اور اس بادل میں جو زمین اور آسمان کے درمیان مسخر ہے (غرض ان تمام مظاہر میں) عقل مندوں کے لیے یقیناً (بہت سی) نشانیاں (دلائل ربوبیت) موجود ہیں۔

یہ قرآنِ حکیم کی ایک اہم اور جامع ترین آیت ہے جس میں وجود باری اور اس کی توحید (وحدانیت) کے آٹھ دلائل مذکور ہیں[1] اور دیگر مقامات میں ان کی تفصیل مذکور ہے۔ اور اس قسم کی آیات سے مقصود خلاقِ عالم کی ربوبیت و الوہیت کا اثبات ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور آیت کریمہ سے پہلی والی آیت کریمہ اس حقیقت پر روشنی ڈال رہی ہے:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔ (بقرہ: ۱۶۳)

اور تمہارا الٰہ (معبود) ایک ہی الٰہ ہے اس کے سوا دوسرا کوئی الٰہ (اس پوری کائنات میں) موجود نہیں ہے۔ وہ (اپنی مخلوق پر) بڑا مہربان ہے۔

تسخیر اشیاء اور خدائی نعمتیں

اور اس دعوتِ فکر کا دوسرا بنیادی مقصد تسخیر اشیاء ہے۔

[1] دیکھئے تفسیر کبیر: ۴/۱۹۷، دار الفکر بیروت، ۱۹۹۳ء۔

یعنی مظاہر عالم میں غور و فکر اور ان کی جانچ پڑتال کے باعث مادی اشیاء میں ودیعت شدہ مادی فوائد یا "خدائی نعمتوں" سے مستفید ہو کر ایک حیثیت سے انسانی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانا اور دوسری حیثیت سے دینِ الٰہی کے مادی و سیاسی غلبے کے لیے فوجی و عسکری قوت و طاقت حاصل کرنا ہے جو مادی اشیاء کی "توڑ پھوڑ" سے حاصل ہوتی ہے جیسے برق اور بھاپ، جوہری توانائی، برقی مقناطیسی لہریں اور لیزر شعاعیں وغیرہ، جن کے باعث آج انسان ٹکنالوجی کے میدان میں زبردست کارنامے انجام دے رہا ہے اور پوری دنیا کو زیر و زبر کر کے اپنی سیادت جتا رہا ہے۔ مادی اشیاء کے اندر چھپے ہوئے یہ سارے فوائد در اصل وہ پوشیدہ نعمتیں ہیں جن کو قرآنِ حکیم میں "باطنی نعمتیں" کہا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً۔ (لقمان: ۲۰)

کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی تمام چیزوں کو تمہاری تابع دار کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی تمام نعمتیں پوری کر دی ہیں؟

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (جاثیہ: ۱۳)

اور اس نے اپنے فضل سے زمین اور آسمانوں کی تمام چیزوں کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے۔ یقیناً اس (مظہر ربوبیت) میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے (کافی) نشانیاں موجود ہیں۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراہیم: ۳۴)

اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا بھی چاہو تو نہ کر سکو گے۔

چنانچہ ان مادی فوائد کو "خدائی نعمتیں" قرار دینے کا فلسفہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ تمام فوائد انسانیت کے فائدہ کے لیے استعمال کیے جائیں نہ کہ اسے نقصان پہنچانے کی غرض سے۔ لہذا اگر یہ مادی فوائد خدا پرست لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو آج ضرور نوع انسانی ان فوائد سے مستفید ہوتی اور ان کے ضرر سے بچی رہتی۔ مگر موجودہ جنگ باز قوموں اور مادہ پرستوں نے ان اشیاء کے مضر پہلوؤں کا استعمال کرکے سارے جہاں کو ایک جہنم زار بنا دیا ہے۔ یہ بھی عالم انسانی کا ایک بہت بڑا نقصان ہے جو اہل اسلام کے اس میدان سے ہٹ جانے کے باعث پیدا ہوا ہے۔

غرض مقصد اول سے فکری اعتبار سے دین الٰہی کا استحکام عمل میں آتا ہے اور مقصدِ ثانی سے انسانی زندگی کی بہتری عمل میں آتی ہے اور اس کے تمدن کا ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ مگر اس باب میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ بلکہ جو بھی قوم موجودات عالم میں غور و فکر کرکے ان کی تسخیر کرے گی وہ ان فوائد سے ضرور متمتع ہوگی۔ کیونکہ یہ مادی و تمدنی فوائد دراصل وہ انعاماتِ الٰہی ہیں جو مادی اشیاء میں غور و فکر کرکے نظامِ ربوبیت کی تنقیح و توجیہ کرنے یا خدائی "نشانیوں" (دلائل ربوبیت) کو اجاگر کرنے کے صلے میں عنایت کیے جاتے ہیں۔

اسلام کی جامعیت

اس بحث سے بخوبی واضح ہوگیا کہ اسلام ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ وہ دین و دنیا کے ملاپ کا ایک کامل اور بے عیب تصور پیش کرتا ہے اور فطرت و شریعت یا مادیت اور روحانیت میں کامل توازن قائم کرتے ہوئے ایک حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اپنانے پر زور دیتا ہے۔ چنانچہ جب تک اسلامی معاشرہ ان دونوں میدانوں میں افراط و تفریط کے بغیر سرگرم کار رہا اس میں کسی قسم کا فکری انتشار پیدا نہ ہوا جس طرح کہ آج دین و دنیا میں تفریق کے باعث اس قسم کا انتشار مسلم معاشروں میں نظر آرہا ہے۔

اور اس کے نتیجے میں ہمارے نوجوان مایوسی کا شکار ہوکر مغربی ملکوں کی "مادیت" میں پناہ لینے پر خود کو مجبور پارہے ہیں کیونکہ کسی بھی معاشرہ کو مادیت سے الگ کرکے صرف روحانیت پر زور دینے کا نتیجہ وہی ہوسکتا ہے جو ماضی میں عیسائیت کے ساتھ پیش آیا اور وہ مادیت کے سامنے مکمل طور پر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگئی اور یہی صورت حال آج مسلم معاشرہ کو بھی درپیش ہے۔ لہذا مسلم نوجوانوں کا دین و شریعت پر اعتماد بحال کرنے کے لیے اسلامی نظریات و تعلیمات کا مکمل نفاذ ضروری ہے۔ تاکہ وہ اپنے دین و شریعت پر مضبوطی کے ساتھ کاربند رہتے ہوئے تمدن و اجتماع یا سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھیں اور دین و شریعت کے سایے میں تمدنی کارنامے انجام دے سکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام صرف شرعی و اخلاقی مسائل ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ فکری و نظریاتی اور تمدنی و اجتماعی مسائل میں بھی اہل اسلام کی مکمل رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

فطرت و شریعت میں تطبیق

غرض اسلام کی جامع تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ قرون وسطیٰ میں ہمارے اسلاف نے دین و دنیا میں تفریق کیے بغیر دونوں میدانوں میں ترقی کرکے اقوام عالم کی کامیاب قیادت کی اور اپنے پیچھے علوم و فنون کا گرانمایہ سرمایہ چھوڑ گئے۔ چنانچہ ایک طرف مسلم فلاسفہ اور سائنس داں تھے جو نظام کائنات میں غور و خوض کرکے نئے نئے علمی حقائق دریافت کیا کرتے تھے تو دوسری طرف علمائے دین کا ایک خاص گروہ تھا جو فطرت و شریعت میں تطبیق دے کر دین و شریعت کی حقیقت واضح کرتا اور ان دونوں کے درمیان پیدا شدہ تناقض کو دور کرتا تھا۔ پہلے گروہ میں یعقوب بن اسحٰق کندی، جابر بن حیان، محمد بن موسیٰ خوارزمی، ابونصر فارابی، محمد بن زکریا رازی، ابن ہیثم، بوعلی سینا، ابوریحان البیرونی، ابن نفیس اور ابوالقاسم الزہراوی وغیرہ نظر آتے ہیں اور

دوسرے گروہ میں امام ابوالحسن اشعری، امام ابو منصور ماتریدی، امام الحرمین جوینی، امام غزالی، امام رازی، علامہ ابن رشد، علامہ قزوینی، امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم، علامہ تفتازانی، قاضی عبدالرحمن ایجی اور علامہ شریف جرجانی وغیرہ بھی دکھائی دیتے ہیں، جنھوں نے اپنے وقت کے کلامی مسائل پر کام کرکے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، جو اس راہ میں کام کرنے والوں کے لیے ایک نمونہ اور مثال ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ امام غزالی، امام رازی اور امام ابن تیمیہ کی خدمات کو کسی بھی طرح بھلایا نہیں جا سکتا۔

فطرت اور شریعت یا مادیت اور روحانیت کے درمیان پیدا ہونے والے تناقض وتضاد کو دور کرنے کے لیے اس طرح کا عمل ہر دور میں ضروری ہے تاکہ اس کے نتیجے میں اہل اسلام اور خاص کر مسلم نوجوانوں کا یقین وایمان دین ابدی پر بحال ہو سکے اور اس کے نتیجے میں ان کے اندر اعتماد اور احساس برتری کے جذبات پیدا ہو سکیں۔ چنانچہ فطرت وشریعت کے درمیان تطبیق کے اس عمل کی وضاحت صحیفۂ خداوندی میں اس طرح آئی ہے، جو اہل ایمان کے لیے خوشی ومسرت اور ان کے ایمان میں اضافے کا باعث بن سکتی ہے اور اس کے نتیجے میں ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آسکتی، بلکہ استحکام پیدا ہوتا ہے:

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (عنکبوت: ۴۴)

اللہ نے زمین اور آسمانوں کو حقانیت (حکمت ومصلحت اور مقصد) کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یقیناً ان (مظاہر) میں اہل ایمان کے لیے ایک بڑی نشانی موجود ہے۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ

رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ۔ (نحل: ۱۰۲)

کہہ دو کہ اس (کتاب) کو تیرے رب کی طرف سے روح القدس نے حقانیت کے ساتھ اتارا ہے تاکہ وہ اہل ایمان کو ثابت قدم رکھ سکے اور فرمانبرداروں کے لیے ہدایت اور خوشخبری کا باعث بن سکے

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ۔ (نحل: ۸۹)

اور ہم نے تجھ پر وہ کتاب اتاری ہے جو ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والی ہے اور وہ اہل اسلام کے لیے ہدایت، رحمت اور خوشخبری ہے

علمائے اسلام کی ایک کوتاہی

اس اعتبار سے اسلام نے دین ودنیا کی جامعیت کا ایک کامیاب تصور پیش کرکے ادیان ومذاہب کی تاریخ میں ایک تاریخ ساز رول ادا کیا تو دوسری طرف اہل اسلام نے اپنے سنہرے دور میں ان دونوں پہلوؤں کو عملی دنیا میں برت کر ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا اور اس کے نتیجے میں فطرت وشریعت میں کامل مطابقت کا ظہور ہوا چنانچہ مسلمانوں کے زریں دور میں دین اور "علم" یا دین اور جدید اکتشافات کے درمیان کشمکش کے وہ مناظر کبھی رونما نہیں ہوئے جیسا کہ اہل کلیسا (چرچ) اور اہل علم کے درمیان اس قسم کے افسوسناک مناظر ظاہر ہوئے اور اس کے نتیجے میں الحاد ولادینیت نے جنم لیا۔

مگر موجودہ دور میں علمائے اسلام کی اس باب میں کوتاہی کے باعث پھر وہی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جو عیسائیت اور جدید اکتشافات کے درمیان کشمکش کا باعث بنی تھی اور موجودہ مسلم نوجوانوں کے علوم مغرب پر "ایمان" اور اسلام پر "بے یقینی" کی ایک بہت بڑی وجہ علمائے اسلام کا منفی رویہ بھی ہے جو جدید علوم سے لاتعلقی اور ان پر بے اعتباری کی وجہ سے پیدا ہوا ہے

اگر علمائے اسلام دینِ ابدی کی تاثیر اور اس کی کاملیت پر یقین کرتے ہوئے روشن فکری اور وسیع النظری کا مظاہرہ کرتے اور اسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے فطرت و شریعت میں تطبیق دے کر ان دونوں کے حدود و ضوابط واضح کرتے تو اس سے جہاں ایک طرف مسلم حکومتوں کو سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھنے میں مدد ملتی تو دوسری طرف مسلم نوجوانوں کی ذہن سازی بھی بخوبی ہوتی اور وہ دین سے برگشتہ ہو کر افکارِ مغرب کی وادیوں میں بھٹکتے نہ پھرتے۔

مسلم حکومتوں کا زوال اور اس کے نتائج

سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں موجودہ مسلم معاشرہ کی پسماندگی میں بعض تاریخی اسباب کارفرما نظر آتے ہیں اور اس سلسلے میں سب سے بڑا عامل یہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں مسلم حکومتوں کے زوال کے باعث مسلم معاشرہ کا سائنسی علوم سے رشتہ پوری طرح ٹوٹ چکا ہے، جس کی وجہ سے نہ صرف عالمِ اسلام سخت نقصان سے دوچار ہوا بلکہ اس کے منفی اثرات سے مسلم معاشرہ بھی بچ نہیں سکا ہے۔

واضح رہے سائنسی علوم میں اہلِ اسلام کی پسماندگی محض دنیوی اعتبار سے نہیں بلکہ دینی و شرعی اور فکری و نظریاتی اعتبار سے بھی ہے۔ دنیوی اعتبار سے ظاہر ہے کہ جو قوم مادی علوم میں پیچھے ہو جائے وہ تمدنی، عسکری اور سیاسی میدان میں بھی دیگر قوموں سے پیچھے ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ علوم آج قوت و طاقت اور رعب و دبدبے کا مظہر قرار پا چکے ہیں اور جہاں تک دینی و شرعی معاملات کا تعلق ہے تو جدید علوم و مسائل کی روشنی میں فطرت و شریعت کے درمیان تطبیق دے کر مسلم معاشرہ میں توازن قائم رکھنے کی بھی ضرورت پڑتی ہے تاکہ فکری و نظریاتی اعتبار سے اہلِ اسلام اور خاص کر نوجوان طبقے کو قابو میں رکھا جاسکے۔ ورنہ فطرت و شریعت میں تناقض کے باعث معاشرہ میں فکری انتشار پیدا ہو سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر

دین و دنیا میں تفریق کے باعث معاشرہ پر منفی اثرات پڑتے ہیں جو دین سے برگشتگی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے اسلام جیسے دینِ فطرت نے دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے فطرت و شریعت دونوں میدانوں میں جامع ہدایات دے کر مسلم معاشرہ کی ہر اعتبار سے رہنمائی کی ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں مسلم حکومتوں کے زوال کے باعث مسلم معاشرہ میں جو ہمہ جہتی زوال آیا تو اس کے نتیجے میں نہ صرف عالمِ اسلام کو سخت نقصان پہنچا بلکہ مسلم معاشرہ بھی پسماندہ بن کر فکری انتشار اور قنوطیت کا شکار بن گیا۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ علمائے اسلام نے سوجھ بوجھ سے کام نہیں لیا اور کتاب الٰہی کی روشنی میں امتِ مسلمہ کی صحیح رہنمائی کرنے سے عاجز رہے۔ چنانچہ انھوں نے دین و شریعت کا ایک محدود دائرہ بنا کر اسلام کی تمدنی و اجتماعی تعلیمات کو بالکل نظر انداز کر دیا، گویا کہ کتاب الٰہی میں ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

اس اعتبار سے آج اسلام کا دائرہ محض عبادات و اخلاق اور چند معاملاتِ زندگی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ اسلام ایک مکمل دین اور مکمل تہذیب کا حامل ہے اور وہ جس طرح شرعی و اخلاقی معاملات میں اہلِ اسلام کی رہنمائی کرتا ہے بالکل اسی طرح وہ تمدنی و اجتماعی معاملات میں رہنمائی کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اسلام کے مکمل دین ہونے کا جو اعلان کیا گیا ہے وہ ہر حیثیت سے ایک کامل دین ہونے کا مظہر ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ — آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین

عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ — کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری

دِیْنًا۔ (مائدہ : ۳)	کر دی اور اسلام کو تمہارے لیے بحیثیت ایک دین کے پسند کر لیا ہے۔

اس سلسلے میں امام شافعی کا دعویٰ تھا کہ جب بھی کسی مسلمان کو کوئی مسئلہ پیش آجائے تو اس کا حل کتاب اللہ میں ضرور مل جائے گا۔

قال الشافعی: فلیست تنزل بأحد من اهل دین الله نازلة، الا فی کتاب الله الدلیل علی سبیل الهدی فیها[1]

اور یہ مسائل صرف دینی و شرعی معاملات ہی سے متعلق نہیں بلکہ وہ تمام فکری و نظریاتی اور تمدنی و اجتماعی معاملات سے بھی متعلق ہیں اور اس اعتبار سے کتاب الٰہی میں ہر مسئلے اور ہر قضیہ کا حکم موجود ہے۔ کیونکہ ایک مومن و مسلم صرف حکم الٰہی ہی کا پابند ہے، اسی لیے ارشاد باری ہے:

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یَقُصُّ الْحَقَّ وَھُوَ خَیْرُ الْفَاصِلِیْنَ۔ (انعام : ۵۷)	حکم کرنا صرف اللہ کا کام ہے وہ حق بات بیان کرتا ہے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔
اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ، اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ، ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔ (یوسف : ۴۰)	حکم صرف اللہ ہی کا ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کی بندگی کی جائے یہی سیدھا راستہ ہے۔

(باقی)

[1] الرسالۃ، ایڈٹ کردہ احمد محمد شاکر، ص ۲۰، مطبوعہ مصر، ۱۹۷۹ء، نیز ملاحظہ ہو: الاتقان فی علوم القرآن، جلال الدین سیوطی، ۲/۱۶۰، مصر، ۱۹۷۸ء۔

علامہ اقبال کی مکتوب نگاری پر ایک نظر

از
پروفیسر اکبر رحمانی۔ جلگاؤں

خطوط دلی جذبات و احساسات کے آئینہ دار ہوتے ہیں، کبھی کبھی مکتوب نگار اس یقین کے ساتھ اپنی نجی زندگی کے اسرار سے پردہ اٹھاتا ہے کہ یہ رازدارانہ باتیں مکتوب الیہ تک ہی محدود رہیں گی اور دوسروں پر ظاہر نہ ہوں گی۔ خطوط چونکہ شخصی اور نجی ہوتے ہیں اس لیے مکتوب نگار بعض اوقات ایسی باتیں بھی بے جھجک بیان کر دیتا ہے جن کو کسی مصلحت اور اصولِ اخلاقیات کی بنا پر دوسروں کے سامنے کھل کر بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے ڈاکٹر جانسن کہتے ہیں کہ:

"THE MANS SOUL LIES NAKED IN HIS LETTERS"

یعنی خطوط میں انسان کی روح بالکل عریاں ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ قریشی خطوط کی ادبی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انسان سرگوشیوں میں بارہا ایسی باتیں کر جاتا ہے جن کو مصلحت، تہذیب، اصولِ اخلاق یا کسی اور خاص کمزوری کی بنا پر شاید کھلم کھلا کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ بعض اوقات اپنے کسی فعل کے اسباب عام لوگوں کے سامنے پیش کرنے سے ہچکچاتا ہے لیکن

مخصوص احباب کے سامنے بے جھجک بیان کر دیتا ہے اور ایسا کہنے میں کوئی حجاب مانع نہیں ہوتا۔ ایسے میں کسی کی افتادِ طبیعت کا اندازہ لگانے، اس کے اصل اخلاق، اسکی حقیقی نیت اور اس کی بے لاگ رائے معلوم کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں کہ جہاں تک ہوسکے اس کے ذاتی اور ایسے افعال کی تلاش کی جائے جو اسے ایسی شکل وصورت اور ایسے حالات میں سرزد ہوئے ہوں جب کہ اس کو یقین ہو کر دوسرا کوئی ان سے واقف نہیں ہوسکتا.... یہی وجہ ہے کہ اب مورخین اور سوانح نگاروں کی اکثریت نجی خطوط پر سب سے زیادہ زور دیتی ہے اور داخلی شہادتوں پر سب سے زیادہ بھروسہ کرتی ہے"۔[1]

خطوط کی سب سے بڑی خصوصیت بقول ڈاکٹر عبداللہ چغتائی "یہ ہوتی ہے کہ ان میں عموماً تصنع کا عنصر نہیں ہوتا اور لکھنے والے کا مافی الضمیر مکمل بے ریائی کے ساتھ مکتوب الیہ تک منتقل ہوجاتا ہے۔ یہ خصوصیات تمام اچھے مکاتیب میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں، جبکہ تصانیف میں یہ ناپید ہوتی ہیں۔ بقول شخصے خطوط میں انسان ایک طرح خود سے باتیں کرتا ہے۔ یہ دلی حالات وجذبات اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہوتے ہیں۔ ہمیں بڑے لوگوں کی زندگی کے اہم ترین واقعات زیادہ تر خطوط کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں"۔[2]

انسان جب خط لکھتا ہے تو نہایت بے تکلفی کے ساتھ قلم برداشتہ لکھتا ہے۔ علاوہ ازیں خط لکھتے وقت مکتوب نگار کا مقصد اس کی طباعت نہیں ہوتا۔ اس لیے اکثر مشاہیر نے اپنے نجی خطوط کی اشاعت کو پسند نہیں کیا ہے۔ غالبؔ جن کی 'شناخت' اور 'شہرت' میں ان کے خطوط کا اہم حصہ ہے انہوں نے اپنے خطوط کی اشاعت کی سخت مخالفت کی تھی۔ غالبؔ کی

---

[1] مکاتیب اقبال بنام گرامی مرتبہ عبداللہ قریشی۔ لاہور۔ ص ۶۶-۶۷۔ [2] اقبال کی صحبت میں۔ عبداللہ چغتائی، لاہور ص ۳۰۴۔

طرح علامہ اقبالؔ بھی اپنے خطوط کی اشاعت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کی زندگی میں ان کے خطوط کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔ جب خواجہ حسن نظامی نے علامہ کے چند خطوط "اتالیق خطوط نویسی" میں چھاپ دیے تو انہیں بہت پریشانی ہوئی تھی۔[1] اور جب انہیں معلوم ہوا کہ بعض احباب ان کے خطوط کو محفوظ رکھ رہے ہیں تو ان کی پریشانی اور بڑھی اور انہوں نے اس سے مکتوب الیہم کو منع کیا۔ چنانچہ علامہ اقبال ایک خط میں نیاز الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

"مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ آپ میرے خطوط محفوظ رکھتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا جب انہوں نے بعض خطوط کو ایک کتاب میں بھی شایع کر دیے تو مجھے بہت پریشانی ہوئی۔ کیونکہ خطوط عجلت میں لکھے جاتے ہیں اور ان کی اشاعت مقصود نہیں ہوتی۔ عدیم الفرصتی تحریر میں ایک ایسا انداز پیدا کر دیتی ہے جس کو پرائیوٹ خطوط میں معاف کر سکتے ہیں مگر ان کی اشاعت نظرِ ثانی کے بغیر نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ میں پرائیوٹ خطوط کے طرزِ بیان میں خصوصیت کے ساتھ لاپرواہ ہوں امید ہے کہ آپ میرے خطوط کو اشاعت کے خیال سے محفوظ نہ رکھتے ہوں گے"۔

(مکتوب اقبال محررہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۹ء)[2]

اقبال نہ اپنے ذاتی خطوط کی اشاعت کو پسند کرتے تھے اور نہ دوسروں کے ذاتی خطوط کی اشاعت کو، اس کی ایک مثال علامہ کے ایک قریبی دوست ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بانگِ درا کے ساتھ علامہ ایک چھوٹی سی کتاب بھی شایع کرنا چاہتے تھے... یہ کتاب دراصل حضرت اکبر الہ آبادی کے خطوط کا مجموعہ تھا، جس کے متعلق علامہ نے یہی فرمایا

---

[1] مطالعہ اقبال۔ مرتبہ گوہر نوشاہی ص ۲۲ [2] مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین احمد خاں۔ لاہور ص ۲۴۔

تھا کہ وہ بالکل مرتب شدہ ہے۔ اس پر ضروری حواشی بھی ہوں گے اور لوگ اسے بہت پسند کریں گے۔ لوگوں میں اس مجموعہ کا چرچا کافی دیر رہا...۔ مگر یہ کتاب کبھی منظرِ عام پر نہ آئی...۔ خیال یہی ہے کہ اول اول تو علامہ نے ان کی افادیت کے پیشِ نظر انہیں شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر پھر اس خیال سے انہیں ضایع کر دیا کہ جس طرح وہ اپنے ذاتی خطوط کی اشاعت اور تشہیر پسند نہیں فرماتے اسی طرح دوسروں کے خطوط کی اشاعت بھی مناسب نہیں ہے۔"[1]

اقبال جس عہد اور ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے وہ اتنا ساز گار نہیں تھا جیسا کہ آج ہے، مذہب کی ظاہری رسوم کا دلدادہ اور صوفیوں کا طبقہ ان کی حق گوئی اور بے باکی پر خفا تھا تو نام نہاد اہلِ زبان ان کے کلام پر جا و بے جا اعتراضات کر رہے تھے، ایسے ماحول میں خطوط کی نظر ثانی کیے بغیر من وعن اشاعت مخالفین کے ہاتھ تنقید و نکتہ چینی کا ایک زبردست ہتھیار فراہم کرنے کے مترادف تھا۔ بعض خطوط ایسے بھی تھے جن پر علامہ نے 'پرائیوٹ' اور 'کانفڈنشل' تحریر کر رکھا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہ خطوط اشاعت کے لیے قطعی نہیں تھے۔ کم از کم اس زمانے میں۔ اس لیے علامہ موصول شدہ خطوط کو (سوائے اکبر الٰہ آبادی کے) جواب لکھنے کے فوراً بعد تلف کر دیتے تھے۔[2]

دراصل اقبال کی یہ خواہش کہ ان کے خطوط اشاعت کے خیال سے محفوظ نہ رکھے جائیں اپنے زمانے کے خاص حالات اور لوگوں کے مزاج کی وجہ سے تھی۔ ہاں اگر یہ خطوط نظر ثانی کے بعد اور اپنے پس منظر اور حواشی کے ساتھ شایع کیے جاتے تو علامہ کو بھی اعتراض نہ ہوتا۔ علامہ خطوط کی ادبی اہمیت وافادیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ حاجی محمد احمد

۱؎ اقبال کی صحبت میں۔ عبداللہ چغتائی۔ ص ۲۸۳-۲۸۲ ۲؎ ایضاً۔ ص ۲۸۱

خاں صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"شاعر کے لٹریری اور پرائیوٹ خطوط سے اس کے کلام پر روشنی پڑتی ہے اور اعلیٰ درجہ کے شعراء کے خطوط شایع کرنا لٹریری اعتبار سے مفید ہے۔"[1]

اقبال کی یہ رائے ان کے مکاتیب پر بھی صادق آتی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور فرماتے ہیں: "اقبال کے کلام کی سب سے اچھی شرح ان کے خطوط ہیں"[2] اور محمد عبداللہ قریشی کے نزدیک "علامہ کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے ان کے نجی اور ذاتی خطوط کے عظیم سرمائے کو سب سے اہم کلیدی حیثیت حاصل ہے"[3] پروفیسر غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں:

"اقبال کے خطوط ان کے حالات، خیالات، معاملات، جذبات، نظریات اور افکار کے مختلف گوشوں پر نظر ڈالتے ہیں...۔ اقبال کے خطوط ان کی شخصیت اور افکار کا ایک ایسا صاف شفاف آئینہ ہیں جس پر انداز بیان کی کوئی باریک سی تہہ بھی نہیں جو حقیقت کو دھندلا سکے۔"[4] ممتاز حسن کی نظر میں "علامہ کے خطوط ان کی شخصیت کا آئینہ ہیں۔"[5]

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی مکاتیب اقبال کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مکاتیب اقبال کے ضمن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ زندگی کے رازہائے سربستہ پر اور زندگی کے حقایق پر جس طرح ان کے خطوط سے روشنی پڑتی ہے وہ دیگر ذرایع اظہار سے توانا ہے...۔ ان کے خطوط جہاں ان کی شخصی زندگی کا آئینہ ہیں وہاں متعلقہ عہد کے سوانح اور وقائع کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔"[6]

۱؎ انوار اقبال۔ بشیر احمد ڈار۔ ص ۱۱ ۲؎ اقبال اور ان کا فلسفۂ حیات۔ لاہور۔ ص ۱۱۹ ۳؎ روح مکاتیب اقبال لاہور۔ ص ۶۵ ۴؎ اقبال۔ ایک مطالعہ۔ غلام حسین ذوالفقار۔ لاہور۔ ص ۲۴۴ ۵؎ پیش لفظ مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ ص ل ۶؎ اقبال کی صحبت میں۔ ص ۲۹۱

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کہتے ہیں: "خطوط اقبال، کلام اقبال کی سب سے زیادہ معتبر اور مستند تفسیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔"[1] ایک اور جگہ وہ رقمطراز ہیں:

"مکاتیب غالب کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ خطوں میں حیاتِ غالب کا ایک ایک لمحہ موجود ہے اور اسے ترتیب دے کر غالب کی اچھی سوانح عمری ترتیب دی جا سکتی ہے۔ بعینہ یہی بات مکاتیب اقبال کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ مکاتیب، اقبال کی ایک جامع سوانح حیات کے لیے ٹھوس اور مستند مواد فراہم کرتے ہیں بلکہ مکاتیب کے ذریعے ان کی شخصیت و نفسیات کے بعض دلچسپ گوشے سامنے آتے ہیں اور ان کے شعر و فلسفہ کی تشریح بھی ہوتی ہے۔"[2]

علامہ اقبال کی شخصیت، ان کے افکار و نظریات اور ان کی شاعری کو سمجھنے کے لیے مکاتیب اقبال کی اشاعت نہایت ضروری تھی۔ اس کے بغیر مطالعہ اقبال اور کلام اقبال کی تفہیم نامکمل رہتی۔ مکاتیب غالب کی جو اہمیت غالبیات میں ہے اس سے کہیں زیادہ مکاتیب اقبال کی اقبالیات میں ہے۔

مکاتیب اقبال کے جتنے مجموعے شایع ہوئے وہ سب علامہ اقبال کی وفات کے بعد وقفے وقفے سے شایع ہوئے۔ چونکہ یہ علامہ کی نظر ثانی اور اجازت کے بغیر شایع ہوئے ہیں اس لیے انہیں اقبال کی باقاعدہ 'تصانیف' قرار نہیں دیا جا سکتا۔[3] لیکن انہیں مستند متنِ اقبال کا درجہ ضرور حاصل ہے۔ اس لحاظ سے اقبالیات میں ان کی حیثیت مسلمہ ہے۔

اقبال کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ زندگی کے معمولات میں وہ کوئی مستند اور

۱؎ خطوط اقبال۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ دہلی۔ ص ۱۹ ۲؎ ایضاً۔ ص ۴۰ ۳؎ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ لاہور۔ ص ۲۰۱۔

باقاعدہ شخص نہ تھے۔ بالکل ابتدا ہی سے ان کی طبیعت میں ٹھہراؤ اور جمود کا رجحان تھا۔ پابندیوں اور ضابطوں سے وہ گھبراتے تھے۔ زمانہ طالب علمی میں جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے ہاسٹل میں قیام پذیر تھے انہیں بی۔اے کا طالب علم ہونے کے سبب علاحدہ کمرہ ملا ہوا تھا۔ اس کمرے میں فرشی نشست جمتی، حقے کا دور چلتا اور گھنٹوں گپ شپ رہتی۔ اقبال میر مجلس ہوتے۔ میر غلام بھیک نیرنگ جو ایسی مجلسوں کے چشم دید گواہ ہیں، بیان کرتے ہیں کہ "اقبال کی طبیعت میں اسی وقت سے ایک گونہ قطبیت تھی اور وہ "قطب از جانمی جنبد" کا مصداق تھے۔"[1] سر عبدالقادر بھی کہتے ہیں کہ "اقبال کے ہم نشیں جن میں میں بھی شامل تھا کبھی کبھی ان کو "قطب از جانمی جنبد" کہہ کر چھیڑا کرتے تھے کیونکہ وہ نقل و حرکت کے معاملے میں بہت تساہل برتا کرتے تھے۔"[2] علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد بھی کہتے ہیں "نقل و حرکت کے معاملے میں چچا جان 'زمین جنبد نہ جنبد گل محمد' واقع ہوئے تھے۔"[3] علامہ اقبال کے بھانجے خالد نظیر صوفی بھی اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "وہ (علامہ) فطرتاً تساہل پسند تھے ۔۔۔۔ وقت کی پابندی ان کے لیے مشکل تھی۔ اگر کہیں وقت مقررہ پر پہنچنا ہوتا تو انہیں ہمیشہ دیر ہو جاتی۔"[4] اس تساہل، جمود اور بے قاعدگی کے باوجود خطوط نگاری میں علامہ بہت مستعد اور باقاعدہ تھے۔ شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں:

"نقل و حرکت کے معاملے میں چچا جان 'زمین جنبد نہ جنبد گل محمد' واقع ہوئے تھے لیکن خط و کتابت میں بڑے مستعد تھے۔ ان کے نام خاصی تعداد میں خطوط موصول ہوتے۔ خط کسی عزیز کا ہو یا دوست کا۔ کسی واقف کا ہو یا ناواقف کا۔

۱؎ خطوط اقبال۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ ص ۴۴ ۲؎ ایضاً۔ ص ۴۸ بحوالہ ادبی دنیا لاہور اقبال نمبر، ۳؎ مظلوم اقبال۔ اعجاز احمد کراچی۔ ص ۲۳۴ ۴؎ اقبال درون خانہ ص ۲۲۔

وہ پہلی فرصت میں اپنے ہاتھ سے جواب لکھتے۔ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے کبھی جواب
میں تاخیر ہوجائے تو ہوجائے ورنہ حتی الامکان خط لکھنے والے کو جواب کے انتظار
کی زحمت نہ دیتے۔[1]

سید قدیر نیازی فرماتے ہیں: "حضرت علامہ خط و کتابت میں بڑے مستعد تھے۔ ان کا
ہمیشہ سے معمول تھا کہ ہر خط کا خود ہی مطالعہ کرتے، خود ہی اس کا جواب لکھتے اور دیکھتے کہ
کسی ضروری سے ضروری بات کا ذکر تو نہیں رہ گیا۔ جواب بھی ہمیشہ اولین فرصت میں رقم
فرماتے"[2] علامہ اقبال کے ہم نشیں ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کہتے ہیں: "میرے مشاہدے میں
دو شخص ایسے آئے ہیں جو خطوط کا جواب دینے کے سلسلے میں اس قدر باقاعدگی اور ذمہ داری
کا مظاہرہ کرتے تھے کہ دوسرا کوئی پڑھا لکھا آدمی اس ضمن میں ان کا مقابلہ نہیں سکتا۔ ان میں
سے ایک تو علامہ اقبال تھے جن کا دستور یہ تھا کہ ادھر ڈاکیہ خطوط دے کر جاتا تھا اور ادھر
وہ اپنے خدمتگار علی بخش کو فوراً قلم دان اور کاغذات کا ڈبہ لانے کی ہدایت فرماتے تھے۔
پھر فوراً جواب لکھتے تھے اور اسی وقت علی بخش کے حوالے فرماتے تھے کہ لیٹر بکس میں ڈال آئے"[3]

دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ہر کس و ناکس کے خط کا جواب دینا کسر شان خیال
کرتے ہیں۔ ذاتی حالات کو مدنظر رکھ کر جواب دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ بعض
اوقات عدیم الفرصتی اور جسمانی عوارض بطور خاص جواب لکھنے میں مانع ہوتے ہیں، مگر
حضرت علامہ نے باوجود جسمانی عوارض، علمی مطالعہ میں استغراق اور عدیم الفرصتی کے کبھی
جواب لکھنے سے گریز نہیں فرمایا۔ انہوں نے ہر خط کا جواب لکھا۔ دنیا کے کسی خطے سے

۱؎ مظلوم اقبال۔ اعجاز احمد۔ ص ۲۳۴ ۲؎ مکتوب اقبال، نذیر نیازی۔ لاہور۔ صفحہ ج ۳؎ اقبال کی صحبت میں۔ ص ۳۷۰۔

خط آتا وہ کاتب خط کو جواب دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کے نزدیک وائسرائے ہند
اور ملک کے کسی ادنیٰ ترین فرد کو یکساں اہمیت حاصل تھی[1]

علامہ کے نزدیک خط کا جواب لکھنا اسلامی اور اخلاقی فریضہ تھا۔ اس لیے ان کے یہاں
خط کا جواب لکھنے میں جو مستعدی، تعجیل اور باقاعدگی پائی جاتی ہے وہ اسی فرض شناسی کا نتیجہ
ہے۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی فرماتے ہیں: "اقبال جو کچھ تھے اور ان کی مصروفیات جس نوعیت
کی تھیں وہ کسی سے پوشیدہ نہ تھیں۔ ہر وقت ان کے گرد احباب کا ایک مجمع رہتا تھا جو طرح
طرح کے مسائل پر ان سے گفتگو کرتے تھے۔ نہ صرف علمی اور سیاسی مسائل کے سلسلے میں
وہ علامہ سے استمداد کرتے تھے بلکہ ذاتی اور خانگی مشکلات کے سلسلے میں بھی وہ علامہ اقبال
کو اپنا مشکل کشا سمجھتے تھے۔ جب اس قسم کی مصروفیات سے کچھ وقت بچتا تو وہ مطالعہ علمی
اور فکر شعر و سخن میں منہمک ہوجاتے تھے۔ پھر فکر معاش بھی ساتھ ساتھ تھا جس سے کبھی بھی وہ
مکمل طور پر چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ تاہم ان تمام مصروفیات کے باوجود وہ خطوط کا بروقت
جواب نہ دینا گناہ سمجھتے تھے اور اسے اخلاقی کمزوری پر محمول فرماتے تھے"[2]

عدیم الفرصتی کے علاوہ علامہ اقبال مختلف قسم کے امراض میں بھی مبتلا رہے۔ آخری
عمر میں جبکہ ان کی بصارت کمزور ہوگئی تھی۔ آنکھوں میں موتیا شدت سے اترنا شروع ہوا
تھا۔ ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے کی ممانعت کردی تھی۔ اس کے باوجود خطوط کا جواب
وہ اسی عجلت اور باقاعدگی کے ساتھ اپنے احباب اور عقیدتمندوں سے لکھوا کر بھجواتے تھے۔
ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں: "بصارت کی کمزوری کے سبب ان کے احباب یا عزیز
و اقارب ہی انہیں روزانہ اخبار یا خطوط پڑھ کر سنایا کرتے اور انہی سے خطوط کے

۱؎ اقبال کی صحبت میں۔ ص ۳۷۱، ۴۰۸ ۲؎ ایضاً ص ۳۷۲۔

جوابات، اپنے اشعار یا دیگر نثری مضامین بھی لکھواتے تھے۔ میاں محمد شفیع اور سید نذیر نیازی کے سپرد یہی کام تھا، لیکن ان کی عدم موجودگی میں بعض اوقات مسٹر ڈورس احمد یا راقم بھی یہ خدمت انجام دینے کے لیے حاضر ہوتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جو کوئی پاس بیٹھا ہوتا اس سے پڑھوا یا لکھوا لیتے۔[۱]

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی بھی کہتے ہیں: "آخری عمر میں جب آپ کی بینائی جواب دے گئی تو معمول یہ ہوگیا کہ اپنے احباب اور نیاز مندوں سے خطوط سنتے تھے اور جواب بھی انہی کو املا کرا دیتے تھے۔ مکتوب الیہ سے معذرت بھی کر دیتے تھے کہ چونکہ اپنے ہاتھ سے جواب لکھنے کے قابل نہیں رہ گیا لہذا کسی دوست سے لکھوا رہا ہوں"۔[۲] چنانچہ کئی خطوط میں انکے یہ جملے نظر آتے ہیں:

"یہ خط میں نے ایک دوست سے لکھوایا ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر نے مجھ کو آنکھ کے دوسرے معائنہ تک لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہے"۔[۳] (خط بنام اعجاز احمد محررہ ۱۳ اپریل ۳۷ء)

"میں خرابیٔ صحت اور کمزوریٔ بصارت کی وجہ سے خود خط نہیں لکھ سکتا"۔[۴] (خط بنام نور حسین محررہ ۱۷ مارچ ۳۷ء)

آخری خط[۵] جو علامہ اقبال نے لکھوایا وہ ممنون حسن خاں کے نام ہے اور ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء کا ہے۔ اس کے دو روز بعد یعنی ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہوگئے۔

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اپنی موت سے دو روز قبل تک خطوط کا برابر جواب

---

۱ زندہ رود جلد سوم۔ ڈاکٹر جاوید اقبال۔ لاہور ص ۳۳۴-۳۳۵ ۲ اقبال کی صحبت میں۔ ص ۲۷۶-۷۷
۳ نظام اقبال۔ ص ۳۷ ۴ انوار اقبال۔ ص ۲۱۵ ۵ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے کاظمی آرٹسٹ کے نام ۱۸ اپریل ۳۸ء کے لکھے خط کو آخری مکتوب اقبال قرار دیا ہے جو درست نہیں۔

دیتے رہے۔ یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ آخری برسوں میں ضعف بصارت کے سبب بقلم خود جواب لکھنے سے قاصر تھے لیکن اپنے احباب سے املا کرا کے خود دستخط ضرور کرتے تھے۔[۱] کبھی ایسا بھی ہوتا کہ "علامہ موصول ہونے والے ہر خط کو پڑھوا کر اس کا جواب ارشاد کر دیا کرتے اور کاتب اپنی طرف سے علامہ کے دستخط کر دیتا یا اپنا نام لکھ دیتا تھا"۔[۲]

مندرجہ بالا بیانات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ نے خط کا جواب لکھنے میں کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتا۔ جس نے بھی خط لکھا چاہے وہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، واقف ہو یا ناواقف، معروف ہو یا غیر معروف ہو، نوجوان ہو یا طالب علم ہر ایک کے خط کا جواب دیا۔ ممتاز حسن کہتے ہیں:

"IQBAL WAS A MOST SCRUPULOUS CORRESPONDENT AND I KNOW OF NOBODY WHOEVER WROTE HIM A LETTER WITHOUT GETTING REPLY"[۳]

یعنی اقبال مکتوب نویسی میں نہایت بسیار نویس تھے اور مجھے کسی ایسے شخص کا علم نہیں جس نے اقبال کو خط لکھا ہو مگر جواب سے محروم رہا ہو۔ اقبال کے قریبی دوست ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے بھی اسی بات کو دہرایا ہے[۴]

اقبال خط کا جواب سادے کاغذ، پوسٹ کارڈ یا چھپے ہوئے لیٹر پیڈ پہ غرض جو بھی

---

۱ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ۔ ص ۲۰۷ ۲ مکتوب اقبال بنام جناح از صابر کلوروی مجلہ اقبالیات لاہور مارچ ۱۹۸۸ء ص ۱۲ ۳ دیباچہ LETTERS & WRITINGS OF IQBAL
۴ بحوالہ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ص ۲۰۸۔

میسر آ جا دیتے تھے۔ اقبال کے ہاں جواب کے لیے کاغذ یا پوسٹ کارڈ ہمیشہ کافی تعداد میں گھر میں موجود رہتے۔[1] ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں: "علامہ کا خطوط لکھنے کا لیٹر پیڈ ابتداءً ایک ہی طرح کا تھا جس کے بائیں کونے میں اوپر کی طرف ہاتھی کی چھوٹی سی ابھری ہوئی تصویر ہی ہوتی تھی مگر جب آپ لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بن گئے تو کسی دوست نے آپ کے نام کا پیڈ بنوا دیا جس کے ساتھ ایم۔ ایل۔ سی کے حروف بھی ہوتے تھے۔"[2]

مکاتیب اقبال کے جو عکوس شایع ہوئے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لیٹر پیڈ پر

DR. SIR MOHD. IQBAL KR.

M.A. PH.D

BARRISTOR-AT-LAW

LAHORE

اور بعض پر نام کے ساتھ رہایش کا پتہ چھپا ہوا ہے:

DR. SIR MOHAMMED IQBAL MAYO ROAD

BAR-AT-LAW LAHORE

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی فرماتے ہیں "عام طور پر علامہ خود ہی اپنے لعاب دہن سے لفافوں پر ٹکٹ چسپاں فرماتے تھے اور اس بات کا خاص خیال کرتے تھے کہ ٹکٹ لفافے کے دائیں کونے پر چسپاں کیے جائیں اور اگر ایک سے زیادہ ٹکٹ ہوں تو ان میں تھوڑا تھوڑا مناسب فاصلہ ہو۔ لفافوں کے جو عکس شایع ہو چکے ہیں ان سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔"[3] اقبال نے

[1] خطوط اقبال۔ ص ۴۱ [2] اقبال کی صحبت میں۔ ص ۴۰۷ [3] ایضاً ص ۴۰۹۔

اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں خط لکھے۔ رفیع الدین ہاشمی کہتے ہیں "ان کا اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کا خط نہایت عمدہ، پختہ اور صاف تھا۔"[1] ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں: "علامہ کا خط نہایت پختہ تھا جیسا کہ قدیم دستاویزات میں دیکھنے میں آتا ہے۔ اس قسم کا پختہ منشیانہ خط اب ناپید ہوتا جا رہا ہے۔"[2]

اقبال نے اپنے زمانۂ طالب علمی سے لے کر وفات تک اپنے اعزہ و اقارب، دوستوں، عقیدتمندوں، مداحوں، شاعروں، نقادوں، اخبارات کے ایڈیٹروں اور سیاسی و مذہبی رہنماؤں کو ہزاروں خط لکھے لیکن اب تک بقول صابر کلوروی ۱۱۸۴[3]۔ بقول عبداللہ قریشی ۱۲۳۳[4] اور بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ۱۳۰۵[5] خطوط مختلف مجموعوں کی صورت میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مکاتیب اقبال کی دریافت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ کئی خطوط دریافت ہو چکے ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق علامہ کے مطبوعہ خطوط کی تعداد ۱۴۰۰ سے اوپر تک پہنچ چکی ہے اور آیندہ اس میں برابر اضافے کا امکان ہے۔ علامہ نے اردو اور انگریزی کے علاوہ فارسی اور جرمنی زبانوں میں بھی خط لکھے۔ مگر انہوں نے سب سے زیادہ خطوط اردو میں لکھے ہیں۔

اب تک علامہ اقبال کا سب سے قدیم ترین خط جو دستیاب ہوا ہے وہ مولانا احسن مارہروی کے نام ہے۔ یہ خط علامہ نے گورنمنٹ کالج لاہور کے ہاسٹل سے ۲۸ فروری ۱۸۹۹ء کو لکھا تھا۔ آخری خط دستیاب ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء کا ہے۔ اب تک مکاتیب اقبال کے جو مجموعے شایع ہو چکے ہیں ان کی تفصیل و کیفیت درج ذیل ہے:

[1] خطوط اقبال۔ ص ۳۱ [2] اقبال کی صحبت میں۔ ص ۴۰۹ [3] اشاریہ مکاتیب اقبال۔ صابر کلوروی۔ لاہور ص ۷۹ [4] روح مکاتیب اقبال، ص ۱۲۳۳ [5] تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ۔ ص ۲۰۸۔

(۱) شاد اقبال (۱۹۴۲ء) : یہ اقبال کے اردو خطوط کا پہلا مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے مرتب کیا تھا۔ اس مجموعے میں اقبال کے ۴۹ اور سر کشن پرشاد شادؔ کے ۵۲ اس طرح کل ۱۰۱ خطوط شامل تھے۔ اس مجموعے میں خطوط کو تاریخ وار ترتیب سے شایع کیا گیا تھا۔ پہلا خط اقبال کا تو اسکے جواب میں دوسرا خط شاد کا، تیسرا اقبال کا اور چوتھا شاد کا۔ آخر تک یہی صورت تھی۔ اس مجموعے میں اقبال کے یکم اکتوبر ۱۹۱۶ء سے ۴ جنوری ۱۹۲۷ء تک کے خطوط شامل تھے۔ ’شاد اقبال‘ کا یہ ایڈیشن اب نایاب ہے۔

(۲) اقبال بنام شاد (۱۹۸۶ء) محمد عبداللہ قریشی کا خیال تھا کہ ۱۹۱۶ء سے پہلے اور ۱۹۲۷ء کے بعد بھی علامہ اقبال اور شاد کے درمیان خط و کتابت تھی۔ ان گمشدہ خطوط کا انہوں نے سراغ لگایا۔ پھر اقبال اکاڈمی کراچی کے ڈائریکٹر بشیر احمد ڈار نے ہزاروں روپے خرچ کر کے اس ’متاعِ بے بہا‘ کو اکاڈمی کے لیے حاصل کر لیا[1]۔ یہ کل پچاس خطوط تھے۔ بعد ازاں یہ خطوط ’شاد اقبال‘ کے ۴۹ خطوط اور مہاراجہ کے جوابات کے ساتھ ’اقبال بنام شاد‘ کے نام سے کتابی صورت میں جون ۱۹۸۶ء میں بزمِ اقبال لاہور سے شایع ہوئے۔ اس مجموعے کو محمد عبداللہ قریشی نے مرتب کیا ہے۔ اس نئے مجموعے میں علامہ کے ۹۹ خطوط اور شاد کے ۵۴ خطوط اس طرح کل ۱۵۳ خطوط شامل ہیں۔

(۳) LETTERS OF IQBAL TO JINNAH : یہ محمد علی جناح کے نام علامہ اقبال کے ۱۱۳ انگریزی خطوط کا مجموعہ ہے جو ۱۹۴۳ء میں شایع ہوا۔ یہ خطوط جناح کی زندگی ہی میں مرتب ہو گئے تھے اور اس کا دیباچہ خود جناح نے لکھا تھا[2]۔ تاریخی اعتبار سے یہ مجموعہ نہایت اہم ہے۔ جناح کے نام علامہ کے مزید پانچ خطوط دریافت ہوئے ہیں[3]۔

۱؎ اقبال بنام شاد، ص ۵۶ ۲؎ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، ص ۲۵۸-۲۵۹ ۳؎ ایضاً، ص ۲۶۰۔

اس طرح جناح کے نام علامہ کے خطوط کی تعداد ۱۸ ہو گئی ہے۔ بشیر احمد ڈار نے اپنی کتاب LETTERS OF IQBAL میں بھی ان تیرہ خطوط کو مناسب حواشی و تعلیقات کے ساتھ شامل کیا ہے۔ ان کا اردو ترجمہ ’اقبال نامہ حصہ دوم‘ میں شامل ہے۔

(۴) اقبال نامہ حصہ اول : مختلف اشخاص کو لکھے گئے خطوط کا یہ مجموعہ شیخ عطاء اللہ (لیکچرار معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے مرتب کر کے ۱۹۴۴ء میں شایع کیا تھا[1]۔ مرتب نے خطوط کی تعداد ۲۶۷ بتائی ہے لیکن یہ تعداد درست نہیں۔ خط نمبر ۲۰۵ دراصل اسد ملتانی کی نظم ’شبنم کا قطرہ‘ ہے۔ اس طرح ’اقبال نامہ حصہ اول‘ میں شامل خطوط کی تعداد ۲۶۶ ہے۔ اس مجموعے میں دس اردو خطوط کے عکس بھی شامل ہیں۔ ’اقبال نامہ‘ میں سب سے زیادہ خطوط سید سلیمان ندوی (۷۰) کے نام ہیں پھر ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ حیدر آبادی (۲۹) کے نام ہیں۔ اسی مجموعے میں اقبال کا سب سے قدیم خط محررہ ۲۸ فروری ۱۸۹۹ء (بنام مولانا احسن مارہروی) شامل ہے۔ اب یہ ایڈیشن نایاب ہے۔

(۵) IQBALS LETTERS TO ATTIYA BEGUM : عطیہ بیگم کے نام اقبال کے نو انگریزی خطوں کا یہ مجموعہ فروری ۱۹۴۷ء میں بمبئی سے شایع ہوا تھا۔ اس میں مکاتیب کے علاوہ اقبال کی بعض نظموں کے عکس، ان کی وضاحت اور عطیہ کی یادداشتیں بھی شامل ہیں۔ خطوط اقبال بنام عطیہ فیضی کا اردو ترجمہ سب سے پہلے نگار لکھنؤ (جولائی ۱۹۵۰ء) میں شایع ہوا[2]۔ پھر ستمبر ۱۹۵۶ء میں اقبال اکادمی کراچی نے ”اقبال از عطیہ بیگم“ کے نام سے اس کا اردو ترجمہ شایع کیا۔ مترجم ضیاء الدین برنی تھے۔ ترجمہ اس قدر رواں اور پیارا ہے کہ بقول صابر کلوروی ”یہ گمان گزرتا ہے کہ اقبال نے یہ خطوط اردو ہی میں لکھے ہوں گے“[3]۔

۱؎ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، ص ۲۱۶ ۲؎ اقبال ریویو لاہور جولائی ۱۹۸۲ء، ص ۴۰، حاشیہ ۳؎ ایضاً۔

ان خطوط کا دوسرا ترجمہ منظر عباس نقوی نے کیا ہے جو علی گڑھ سے ۱۹۷۴ء میں شایع ہوا اور تیسرا ترجمہ عبدالعزیز خالد کا ہے جو ۱۹۷۵ء میں آئینۂ ادب لاہور سے چھپا ہے۔

(۶) اقبال نامہ۔ حصہ دوم : کل ۱۰۷ خطوط ہیں۔ شیخ عطاء اللہ نے اسے ۱۹۵۱ء میں لاہور سے شایع کیا تھا۔ پروفیسر صابر کلوروی نے ۶۰ مشترک خطوط کی نشاندہی کر کے اصل خطوط کی تعداد ۱۲۷ متعین کی ہے[۱] جبکہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اصل خطوط ۱۱۲ متعین کیے ہیں[۲]۔ ۳۴ مکتوب الیہم میں محمد علی جناح، اکبر الہ آبادی، مولوی عبدالحق، عطیہ فیضی، سید نذیر نیازی، مہاراجہ کشن پرشاد شاد اور خواجہ حسن نظامی کے نام قابل ذکر ہیں۔

(۷) مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان : یہ علامہ اقبال کے ۹۷ اردو خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو ۱۹ جنوری ۱۹۱۶ء سے ۱۵ جون ۱۹۲۸ء کے درمیانی عرصے پر محیط ہیں۔ بزم اقبال لاہور نے اسے شایع کیا ہے۔ جسٹس ایس۔ اے رحمٰن نے پیش لفظ میں تصدیق کی ہے کہ "میں نے اصل خطوط دیکھ لیے ہیں اور ان کا مقابلہ اس مجموعے کے مشمولہ نقول سے بہ دقتِ نظر کر لیا ہے"۔ سالِ اشاعت درج نہیں تاہم تصدیق نامہ سے ۱۹۵۴ء قیاس کیا جا سکتا ہے۔

(۸) مکتوباتِ اقبال : سید نذیر نیازی کے نام علامہ اقبال کے ۱۸۳ خطوط کا یہ مجموعہ اقبال اکاڈمی کراچی نے ستمبر ۱۹۵۷ء میں شایع کیا تھا جو ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۶ء کے درمیانی عرصے پر محیط ہے۔ ترتیب سنہ وار اور تاریخ وار ہے، مجموعہ خود مکتوب الیہ نے مرتب کیا ہے اور خطوط کا پس منظر اور پیش منظر بھی مفصل لکھا ہے۔ دو خط انگریزی میں اور باقی اردو میں ہیں۔ دو مختصر خطوط ۱۹۳۰ء کے بھی ہیں جب نذیر نیازی دہلی چھوڑ کر لاہور آچکے تھے۔

[۱] اشاریہ مکاتیب اقبال۔ ص ۸۲ [۲] تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ۔ ص ۲۲۵۔

(۹) انوارِ اقبال : بشیر احمد ڈار کی یہ کتاب اقبال اکاڈمی کراچی نے مارچ ۱۹۶۷ء میں شایع کی تھی۔ جو مکاتیب کے علاوہ علامہ کی تقاریظ، مضامین، بیانات، سفرِ مدراس کی روداد اور ان کے ابتدائی کلام پر بھی مشتمل ہے، اس کے ۱۰۵ خطوط یا تو سرے سے کہیں شایع ہوئے ہی نہیں یا اگر شایع ہوئے بھی تو کسی باقاعدہ مجموعے میں شامل نہیں[۱]۔ اس میں دو فارسی خطوط سعید نفیسی کے اور اردو حسن نظامی، سر اکبر حیدری، غلام رسول مہر، محمد دین تاثیر، رشید احمد صدیقی، نواب بہادر یار جنگ وغیرہ کے نام ہیں۔ پیش لفظ ممتاز حسن نے لکھا ہے۔

(۱۰) LETTERS AND WRITINGS OF IQBAL : بشیر احمد ڈار کا مرتبہ یہ مجموعہ نومبر ۱۹۶۷ء میں اقبال اکاڈمی کراچی نے شایع کیا جو مکاتیب کے علاوہ دیگر تحریروں پر بھی مشتمل ہے۔ اس کتاب کے ۳۴ انگریزی خطوط میں سے ۲۶ خطوط کا اردو ترجمہ "اقبال نامہ" میں شایع ہو چکا ہے[۲]۔

(۱۱) مکاتیبِ اقبال بنام گرامی : غلام قادر گرامی کے نام علامہ اقبال کے ۹۰ خطوط کا یہ مجموعہ محمد عبداللہ قریشی کے بسوط مقدمہ اور مفید حواشی کے ساتھ اقبال اکاڈمی کراچی نے اپریل ۱۹۶۹ء میں شایع کیا تھا، جو ۱۱ مارچ ۱۹۱۰ء سے ۳۱ جنوری ۱۹۲۷ء تک کے خطوط پر مشتمل ہے۔ تمہید و تعارف غلام رسول مہر اور ممتاز حسن کے قلم سے ہیں۔ جون ۱۹۸۱ء میں اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور نے دوبارہ اس کی عکسی اشاعت کی ہے۔ جس میں خود ان کے نام کا ایک اور سات بیگم گرامی کے نام کے خطوط کا اضافہ ہے، اس طرح اب کل ۹۹ خطوط ہو گئے ہیں۔

[۱] خطوط اقبال۔ ص ۴۱۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے انوارِ اقبال میں اصل خطوط کی تعداد ۱۰۷ بتائی ہے۔ (دیکھئے تصانیفِ اقبال۔ ص ۲۴۰) [۲] خطوطِ اقبال۔ ص ۴۲۔

(۱۲) **خطوطِ اقبال**: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا مرتب کردہ یہ مجموعہ ۱۹۷۶ء میں مکتبہ خیابان لاہور سے شایع ہوا ہے۔ جس کا عکسی اڈیشن ہندوستان میں ادارہ بیسویں صدی دہلی نے شایع کیا ہے۔ یہ ایک سو گیارہ ۱۱۱ خطوط کسی اور مجموعۂ مکاتیب میں موجود نہیں، اگر ہیں تو ان کا متن ناقص یا غلط ہے، اردو کے ۹۱، انگریزی کے ۱۹ اور عربی کا ایک خط شامل ہے۔ صحتِ متن اس کی اصل خوبی ہے۔ ترتیب تاریخ و سنہ وار ہے۔ مکتوب الیہ کا مختصر تعارف خطوط کا مختصر پس منظر اور خط کے ذیل میں مفید حواشی دیے گئے ہیں۔ مجموعے کے اختتام میں ہر خط کے ماخذ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ مذکورہ خط کہاں کہاں شایع ہوا ہے۔ ۹۱ اردو اور انگریزی خطوط کے عکسی نقول بھی شامل ہیں۔

(۱۳) **روحِ مکاتیب اقبال**: یہ کوئی نیا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں مطبوعہ ۱۲۳۳ مکاتیب کے اقتباسات تاریخ وار درج ہیں۔ اس کے مرتب محمد عبداللہ قریشی نے خطوط کی اقبال ہی کے الفاظ میں تلخیص کر کے گویا دریا کو کوزے میں یا سمندر کو صدف میں بند کر دیا اور عطر کھینچ لیا ہے۔ جو پھول جس گلدستے سے چنا ہے اس کا حوالہ دیا ہے تاکہ شائقین پورا خط حاصل کر سکیں[1]۔

(۱۴) **LETTERS oF IQBAL**: ۴۱۰ انگریزی خطوط کا یہ مجموعہ بشیر احمد ڈار نے مرتب کیا اور اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور نے ۱۹۷۸ء میں اسے شایع کیا ہے۔ اس میں عطیہ فیضی اور جناح کے نام انگریزی خطوط بھی ہیں، اس طرح بشیر احمد ڈار نے ۱۹۶۷ء میں LETTERS AND WRITINGS OF IQBAL کے نام سے جو مجموعہ مرتب کیا تھا اس کے خطوط بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ اس کے صرف پندرہ خطوط نئے ہیں[2]۔ ابتدا میں مکتوب الیہم کا تعارف اور خطوط کے توضیح طلب مقامات کے بارے میں

---

[1] روح مکاتیب اقبال، ص ۶۷-۶۸ [2] اقبال ریویو لاہور جولائی ۸۲ء ص ۸۸۔

مفصل حواشی لکھے ہیں۔ یہ دعویٰ کہ اس مجموعے میں علامہ کے تمام دستیاب خطوط (انگریزی) شامل ہیں درست نہیں ہے[1]۔ ترتیب اس طرح ہے کہ جن مکتوب الیہم کے نام اقبال کے ایک سے زائد خطوط ہیں سب سے پہلے انہیں درج کیا گیا ہے۔

(۱۵) **اقبال نامے**: ڈاکٹر اخلاق اثر کی مرتبہ یہ کتاب ۱۹۸۱ء میں بھوپال سے شایع ہوئی تھی۔ یہ ۷۱ خطوط بقول مرتب "لاہور سے بھوپال میں موجود یا بھوپال سے بھوپال میں موجود اور بھوپال سے باہر موجود اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کو تحریر کیے تھے"۔ اس کے بیشتر خطوط 'اقبال نامہ'، 'مکتوبات اقبال' اور 'خطوط اقبال' سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں محمد شعیب قریشی کے نام ایک اور سر راس مسعود کے نام تین غیر مطبوعہ خطوں کے علاوہ چار ۴ ایسے خط بھی شامل ہیں جن کا مکمل متن پہلی بار سامنے لایا گیا۔

اقبال نامے کے دوسرے ایڈیشن ۱۹۹۰ء میں آٹھ غیر مطبوعہ اردو اور انگریزی خطوط کے عکس شامل ہیں جو پہلے میں نہ تھے، چند مطبوعہ مکاتیب کا بھی اضافہ کیا ہے۔ غیر مطبوعہ خطوط کی دریافت اور بعض خطوں کے محذوف حصوں کی بازیافت اقبال کے متن میں اہم اضافہ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۶) **مکاتیب اقبال بنام شیخ اعجاز احمد**: علامہ اقبال کے خاندانی حالات، عقائد اور دیگر کوائف پر ان کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد (جو کہ قادیانی ہیں) کی یادداشتوں اور تاثرات پر مشتمل کتاب 'مظلوم اقبال' (۱۹۸۵ء) کراچی سے شایع ہوئی ہے جس کے آخر میں علامہ کے والد، بڑے بھائی (اعجاز احمد کے والد)، بہن کریم بی بی اور بھتیجے اعجاز احمد اور مختار احمد کو لکھے گئے ۱۰۳ خطوط بھی شامل ہیں۔ یہ خطوط ۲۴ جون ۱۹۱۴ء سے ۲ دسمبر ۱۹۳۷ء

---

[1] اقبال ریویو لاہور جولائی ۸۲ء ص ۹۱۔

کے درمیانی عرصے پر محیط ہیں۔ ترتیب تاریخ وار ہے، ہر خط سے پہلے پس منظر و پیش منظر بھی ہے، بعض خطوط نامکمل ہیں کیونکہ بقول مرتب "وہ حصے حذف کر دیے گئے ہیں جن میں پچا جان کی تساہل زندگی کے المیہ کا ذکر ہے"[1] لیکن ڈاکٹر رفیع الدین کا خیال ہے کہ اقبال کی زندگی کا یہ پہلو کوئی سربستہ راز نہیں رہا۔ اس اعتبار سے یہ احتیاط پسندی کچھ زیادہ ہی غیر ضروری معلوم ہوتی ہے[2]۔

(۱۷) آندھرا پردیش آرکائیوز میں مکاتیب اقبال : حیدرآباد کے جواں سال محقق اور اسسٹنٹ آرکائیوسٹ سید شکیل احمد نے اپنے محکمہ قدیم حیدرآبادی فائلوں سے اقبال کے سات غیر مطبوعہ انگریزی خطوط کا پتہ چلایا ہے۔ بقول مصلح الدین سعدی "ان میں چار خط کی نقول قدیم حیدرآباد کی سرکاری مثلوں میں دستیاب ہوئی ہیں۔ تین خط علامہ اقبال کے قلم سے اصلی حالت میں محفوظ ہیں"[3] خطوط اور ان کے متعلق حواشی و تشریحات اور سوانح کے بعض پہلوؤں سے متعلق بعض نئے حقائق و معلومات کو مرتب کر کے سید شکیل احمد نے اسے پہلے اقبال اکاڈمی حیدرآباد دکن کے مجلہ 'اقبال ریویو' کی خصوصی اشاعت (مئی ۱۹۸۴ء) میں شایع کیا۔ پھر 'اقبال۔ نئی تحقیق' کے نام سے مارچ ۱۹۸۵ء میں کتابی صورت میں شایع ہوا۔ اس کا پہلا خط ۹ دسمبر ۱۹۲۸ء اور آخری خط ۲ فروری ۱۹۳۸ء کا لکھا ہوا ہے۔

(۱۸) خطوط اقبال بنام ویگے ناسٹ : اقبال کی جرمن زبان کی ٹیوٹر مس ویگے ناسٹ کے نام علامہ کے ۲۷ غیر مطبوعہ خطوط ڈاکٹر سعید اختر درانی نے اپنی کتاب 'اقبال

---

[1] منظوم اقبال۔ اعجاز احمد۔ ص ۲۲۵ [2] ۱۹۸۵ء کا اقبالیاتی ادب۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لاہور۔ ص ۱۵ [3] اقبال۔ نئی تحقیق۔ سید شکیل احمد۔ ص ۱۱۔

یورپ میں' شایع کیے ہیں۔ جو ۱۹۸۵ء میں اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور کے زیر اہتمام ڈاکٹر جاوید اقبال کی تقریظ کے ساتھ شایع ہوئی۔ ۱۷ خط جرمن اور دس انگریزی زبان میں ہیں۔ ان کا زمانۂ تحریر ۱۹۰۷ء سے ۱۹۳۳ء تک ہے۔ ڈاکٹر درانی نے وضاحتی اشارات و تعلیقات میں خطوں کا پس منظر و پیش منظر واضح کیا ہے[1]۔

(۱۹) خطوط اقبال بنام عبدالعزیز مالواڈہ : میاں عبدالعزیز مالواڈہ (ف ۲۸ جنوری ۱۹۷۱ء) کے نام اقبال کے انیس ۱۹ خطوط (پانچ دعوتی رقعات اور چند متفرقات) کا ایک غیر مطبوعہ ذخیرہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کی مساعی سے منظر عام پر آیا ہے۔ یہ سب ادارہ کے شایع کردہ عکسی مرقعے "نوادر" میں شامل ہیں۔ تمام خط انگریزی میں اور ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۸ء تک کے لکھے ہوئے ہیں[2]۔

(۲۰) اقبال جہان دیگر : راغب حسن کے نام اردو انگریزی میں لکھے ہوئے یہ ۴۴ خطوط محمد فرید الحق ایڈوکیٹ نے مرتب اور ۱۹۸۳ء میں گردیزی پبلشرز کراچی نے اسے شایع کیا ہے، کتاب ۱۰۲ صفحے کی ہے[3]۔

(۲۱) IQBAL: HIS POLITICAL IDEAS AT CROOS ROAD : مرتبہ حسن احمد مارچ ۱۹۷۹ء۔ پرنٹ ویل پبلی کیشنز علی گڑھ۔ اس میں اقبال کے نو خطوط مع عکس شامل ہیں۔ پروفیسر ای۔ جی۔ تھامسن (E. J. THAMPSON) آکسفورڈ یونیورسٹی (صفحات ۹۸)[4]۔

کلیات مکاتیب اقبال : جناب مظفر حسین برنی نے علامہ اقبال کے ذخیرۂ

---

[1] ۱۹۸۵ء کا اقبالیاتی ادب۔ ص ۱۱ [2] ایضاً۔ ص ۵۷ [3] کلیات مکاتیب اقبال جلد اول۔ مظفر حسین برنی۔ ص ۳۶ [4] ایضاً۔

مکاتیب کو پانچ جلدوں میں مدون کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس کی تین[۳] جلدیں اب تک دہلی اردو اکادمی کے زیر اہتمام منظر عام پر آچکی ہیں۔ پہلی جلد ۱۸۹۹ء سے ۱۹۱۸ء تک لکھے ہوئے ۴۱۹ خطوط پر مشتمل ہے، اس میں صرف ایک غیر مطبوعہ خط اور ۱۳۳ خطوط کے عکس دیے گئے ہیں جو پہلی بار سامنے آئے ہیں۔ دوسری جلد جنوری ۱۹۱۹ء تا دسمبر ۱۹۲۸ء کے ۴۳۱ خطوط پر مشتمل ہے۔ ایک خط غیر مطبوعہ اور چھ ایسے خطوط ہیں جو ابھی تک کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئے۔ ۱۱۲ خطوط کے عکس بھی شامل ہیں۔ جلد سوم جنوری ۱۹۲۹ء تا دسمبر ۱۹۳۴ء کے ۳۸۲ خطوط پر مشتمل ہے۔ ان میں ۴ غیر مطبوعہ اور ۱۵ خطوط غیر مدون ہیں جو بقول مرتب ابھی تک کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہوئے۔ ۱۰۰ مکاتیب کے عکس بھی دیے گئے ہیں۔

جلد اول ۱۲۰۷ صفحات پر مشتمل ہے تو جلد دوم ۱۲۴۴ اور جلد سوم ۱۱۶۸ صفحات پر۔ سید مظفر حسین برنی نے اقبال کے کل معلوم خطوط کی تعداد ۱۵۰۰ بتائی ہے اور ایک جگہ ۱۴۰۵ لکھی ہے[۱]۔ یہ کلیات دراصل مکاتیب اقبال کی ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین میں مرتب نے امور ذیل کا خاص طور پر دھیان رکھا ہے۔

(۱) تمام خطوط کو تاریخی ترتیب سے جمع کیا گیا ہے۔ جن خطوط کی تاریخیں پچھلے مجموعوں میں غلط چھپ گئی تھیں بعد کی تحقیق کی روشنی میں ان کی تاریخ درست کر لی گئی ہے۔ بعض خطوط پر تاریخ درج نہیں تھی۔ ان کا زمانہ اندرونی اور بیرونی شہادتوں کی روشنی میں متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض خطوط پر تاریخ نہیں ہے اور نہ کوئی قرینہ جس سے زمانہ کتابت کی تعیین ہو سکے۔ ایسے بلا تاریخ خطوط چوتھی جلد کے آخر میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔

۱؎ کلیات مکاتیب اقبال جلد اول۔ ص ۳۲ اور ۳۷۔

(ب) ہر جلد میں مکتوب الیہم اور ان لوگوں کے سوانحی خاکے بھی درج ہیں جن کا حوالہ متن میں آیا ہے۔ کتابوں اور مقامات کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے[۱]۔

صحت متن کا خاص خیال رکھا ہے۔ مطبوعہ خط کے سامنے اصل خطوط کے عکس بھی دینے کی کوشش کی ہے۔ اب تک مکاتیب پر جو کام ہوا ہے اس میں یہ سب سے وقیع کام ہے۔ اس کی وجہ سے مرتب کو 'اقبالیات' میں بقائے دوام حاصل ہو گئی ہے۔ اتنے بڑے کام میں چند خامیوں کا در آنا تعجب کی بات نہیں۔ برنی صاحب کو اس عظیم الشان کام پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

مکاتیب کے مذکورہ بالا مجموعوں کے علاوہ اقبال کے متعدد خطوط ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں اور بعض اشخاص اور اداروں کے پاس غیر مطبوعہ خطوط بھی ہیں۔ دریافت کا سلسلہ جاری ہے۔ اس لیے مکاتیب اقبال کے ذخیرے میں اضافہ کا امکان ہے۔ پہلے پروفیسر صابر کلوروی نے مطبوعہ مکاتیب اقبال کی تعداد ۱۱۸۳ بتائی تھی، لیکن اپنے حالیہ مضمون میں انہوں نے یہ تعداد ۱۷۰۰ لکھی ہے[۲]۔

ان کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ یہ شعر اقبال کی تشریح و تفسیر، تصانیف اقبال کے پس منظر کا کام دیتے ہیں۔ ان سے ان کے بعض تصنیفی منصوبوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی شخصی زندگی فکر و فلسفے اور شب و روز کے گوناگوں معاملات و معمولات کا علم ہوتا ہے[۳]۔

۱؎ کلیات مکاتیب اقبال۔ جلد اول ص ۴۳۔۴۴ ۲؎ مضمون کلیات مکاتیب اقبال۔ ایک جائزہ، مشمولہ ہماری زبان، دہلی شمارہ یکم اگست ۱۹۹۲ء۔ ص ۸
۳؎ خطوط اقبال۔ ۵۷ تا ۶۴۔

معارف کی ڈاک

(۱)

۱۸؍ مارچ ۱۹۹۸ء

برادر عزیز السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

فروری کے معارف میں مولانا عثمان قاسمی مرحوم کے بارے میں "وفیات" کے صفحات پڑھ کر پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ مولانا جمیل احمد صاحب اور نذیر بنارسی صبر حد کے مشاعرے میں اکثر شرکت فرمایا کرتے۔ مشاعرے کے مستقل صدر اقبال احمد صاحب سہیل سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ مولانا عثمان صاحب کی زبانی نذیر بنارسی کا جو شعر آپ نے درج فرمایا ہے، میرے خیال میں اس کے پہلے مصرع میں "چمن جلے جلا کرے" کی جگہ "آگ لگے لگا کرے" ہے اور یہی مناسب بھی معلوم ہوتا ہے[۱]۔ غالباً پورا شعر یوں ہے۔

برق گرے گرا کرے آگ لگے لگا کرے
جس کا چمن میں کچھ نہ ہو فکر چمن وہ کیا کرے

میرے پاس اس وقت نذیر بنارسی کا مجموعہ کلام نہیں ہے ممکن ہے لائبریری میں ہو، آپ دیکھ لیں تو بہتر ہوگا[۲]۔ طبیعت اپنی ابھی بھی ٹھیک نہیں رہتی، کچھ نہ کچھ لگا رہتا ہے، اطبائے کرام اسے تقاضائے عمر کہتے ہیں، تین مہینے سے محمد علی روڈ کے مطب میں نہیں جاسکا۔ کرلا کے دوا خانوں میں ہفتہ میں دو تین بار حاضری ہو جاتی ہے۔ دعا کا خواستگار ہوں۔ حکیم محمد فیاض و حکیم محمد طارق سلام کہتے ہیں۔ متعلقین کو میرا بھی سلام کہیے۔

خیر اندیش : مختار

---

[۱] میرے خیال میں وہی مناسب ہے جو میں نے نقل کیا ہے [۲] افسوس ہے کہ ان کا دیوان موجود نہیں۔

(۲)

از ڈیوزبری، برطانیہ[۱]

۱۹۹۸؍۲؍۴

محترم و مکرم جناب مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی زاد لطفہٗ۔ مدیر ماہنامہ معارف

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے مزاج گرامی بعافیت ہوگا، ایک پروگرام کے تحت ۱۱؍ جنوری ۱۹۹۸ء کو برطانیہ پہنچا۔

۱۔ یہاں معارف ماہ دسمبر باصرہ نواز ہوا، میرے مخلص و کرم فرما اور متبحر عالم دین مولانا محمد برہان الدین صاحب سنبھلی نے اپنے مکتوب میں انتہائی مودبانہ انداز میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی ایک عبارت پر گرفت کی ہے۔ یہ بات متفق علیہ ہے کہ انبیائے معصومینؑ کے سوا کوئی خطاء سے منزہ نہیں ہے اور بقول امام دار الہجرتؒ "ہر شخص کی بات قبول بھی کی جاسکتی ہے اور رد بھی، سوائے صاحبِ قبر ہذاؐ کے" اس لیے سید صاحب کی کسی علمی یا لفظی غلطی پر تنقید کوئی غلط بات نہیں ہے، لیکن راقم کے خیال میں جو گرفت کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام سے متعلق سید صاحب کا جملہ یہ ہے "جو نافرمان قوم پر عذاب آنے کی تاخیر کی وجہ سے بھاگ کھڑے ہوئے"۔ اس پر مولانا سنبھلی کو یہ اعتراض ہے کہ "اس سے ایک نبی محترم کی شان میں سوء ادب کا پہلو نکلتا ہے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بھاگ کھڑا ہونا مذموم محل میں استعمال ہوتا ہے" اس لیے مولانا کا خیال ہے کہ "یہ سبقتِ قلم کا نتیجہ ہے جو غالباً بے خیالی میں تراوش ہوگیا ہے" پھر مطالبہ ہے کہ بہر حال جس سے بچنا چاہیے تھا اب بھی

---

[۱] مولانا خط لکھنے کے بعد بھول گئے اور بھوپال آنے پر اسے روانہ کیا، اس لیے تاخیر ہوگئی۔ (ض)

اس کی تلافی ممکن ہو تو کر دیا جانا ہی مناسب ہے"۔

معارف نے اس پر مختصر حاشیہ اس طرح لکھا ہے " یہ حضرت سید صاحب کے الفاظ اور دراصل قرآنی آیت "ابق الی الفلک المشحون" کا ترجمہ ہیں، سیرت پنجم کے نئے ایڈیشن میں تلافی ممکن ہو سکے گی۔

۲۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ سید صاحب کے الفاظ ہونا کوئی ایسا تقدس نہیں رکھتے کہ ان کی اصلاح نئے ایڈیشن میں توضیح کے ساتھ ممکن نہ ہو لیکن ہاں قرآنی لفظ ایسا تقدس ضرور رکھتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا، اس لیے حاشیہ کی عبارت میں اگر لفظ اور نہ ہوتا تو مناسب تھا، صرف اتنا کافی ہے کہ سید صاحب کے الفاظ لفظ قرآنی کا ترجمہ ہیں، دوسری بات یہ غور طلب ہے کہ جب معارف اس بات کا قائل ہے کہ سید صاحب کے الفاظ میں سوء ادب کا پہلو نہیں نکلتا اور وہ لفظ قرآنی کا ہو بہو ترجمہ ہیں تو پھر اگلے ایڈیشن میں تلافی کے امکان کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے[1]۔ اس طرح تو پھر تمام فارسی و اردو مترجمین کے نئے ایڈیشنوں میں ترمیم کی جانی ضروری ہو جائے گی، یہ بات رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہے کہ الفاظ قرآنی میں تصحیح یا تبدیلی کا ارادہ کیا جائے۔

۳۔ راقم مختصراً یہ کہنا چاہے گا کہ یہ سبقت قلم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ پوری احتیاط کے ساتھ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے ثبت کردہ الفاظ کا انتہائی مناسب و محتاط ترجمہ ہے۔ "ابق" کے لفظ میں بھاگ جانے، بھاگ کھڑا ہونے اور فرار ہو جانے کے معنی لازماً پائے جاتے ہیں،

[1] معارف: بات صرف تلافی کے امکان کے بارے میں تھی البتہ یہ لکھا رہ گیا کہ بشرطیکہ محولہ عبارت میں واقعی سوء ادب کا پہلو اور سید صاحب کی غلطی نکلتی ہو۔ بعد میں ہم نے بھی اردو ترجمے دیکھے تو اسی نتیجے پر پہنچے کہ سید صاحب کے ترجمہ میں غلطی نہیں ہے، گفتگو صرف ابق کے اردو ترجمہ کی ہے۔ قرآنی لفظ میں تصحیح یا تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔

آبق اس نافرمان غلام کو کہتے ہیں جو آقا کی مرضی اور اجازت کے بغیر اس کی خدمت و اطاعت سے روگردانی کر کے بھاگ جائے، اسلام میں بھی عبد آبق کے لیے سخت وعید آئی ہے اسلام سے قبل دنیا کی دوسری قوموں میں "عبد آبق" کی دردناک سزائیں تھیں جیسے قتل، درندوں کے سامنے زندہ ڈال دینا وغیرہ، سید صاحب اور دوسرے مترجمین نے بھی احتیاط کا مزید یہ پہلو رکھا ہے کہ حضرت یونسؑ کے ساتھ لفظ نافرمانی نہیں لکھا کیونکہ معنوی اعتبار سے بلا اذن بھاگ جانے میں یہ معنی خود بخود موجود ہیں۔ اس بنا پر ادب انبیا کے پیش نظر ابق کا یہ ترجمہ نہیں کیا جائے گا کہ "خدا کے حکم سے تشریف لے گئے"۔ اس سے خدا اور کتاب خدا کے ساتھ سوء ادبی لازم آئے گی۔

شاہ عبدالقادر ترجمہ کرتے ہیں: "جب بھاگ کر پہنچا اس بھری کشتی میں" موضح القرآن میں ہے: "لوگوں نے کہا اس میں کوئی غلام ہے مالک سے بھاگا"۔

شاہ رفیع الدین: "جس وقت بھاگ گیا طرف کشتی بھری ہوئی کے"۔

مولانا فتح محمد صاحب: "جب بھاگ کر بھری ہوئی کشتی میں پہنچے"۔

مولانا اشرف علی تھانوی: "جب بھاگ کر بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچے"۔ مولانا تھانوی دوسری آیت کے تفسیری حاشیے میں لکھتے ہیں: "یونس سمجھ گئے کہ میرا یہ فرار بلا اذن عام نہ پسند ہوا"[1]

مفسرین اسلام نیز اہل کتاب کے بیان کردہ قصے میں بھی اس بات پر کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ حضرت یونسؑ بھاگ گئے تھے، کیوں بھاگے تھے اس میں مختلف آرا ہیں، ایک مرجوح رائے یہ ضرور ہے کہ آپ خدا کے حکم سے روگردانی کر کے نہیں بھاگے تھے بلکہ نبی وقت کے

[1] معارف: شیخ الہند کا ترجمہ ہے "جب بھاگ کر پہنچا اس بھری کشتی پر" مولانا شبیر احمد صاحب نے لکھا ہے "کشتی دریا میں چکر کھانے لگی۔ لوگوں نے کہا اس میں کوئی غلام ہے بھاگا ہوا"۔

ایما پر بادشاہ وقت نے جو حکم قوم کے پاس جانے کا دیا تھا اس حکم سے روگردانی کر کے بھاگے تھے، یہ رائے الفاظ و تصریحات قرآنی کی رو سے مرجوح ہے لیکن امام رازی نے اسے انبیائے کرام کی عظمت کے پیش نظر راجح بتایا ہے۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مقصد یہ ہے کہ حکم کا انتظار کیے بغیر مستقر چھوڑ کر چلا جانا ایک متفق علیہ بات ہے جسے بھاگنے سے تعبیر کرنا نص قرآنی کی رو سے غلط نہیں ہے۔

۴۔ یہ موضوع تفصیل کا محتاج ہے۔ راقم بھوپال پہنچ کر اس موضوع کی کچھ تفصیل ارسال کرے گا، جس میں یہ بتایا جائے گا کہ بھاگ کھڑا ہونا مذموم محل ہی میں خدا نے بھی استعمال کیا ہے "وھومذموم" کی تصریح کی گئی ہے" وھو ملیم" بھی قرآنی لفظ ہے،" ولاتکن کصاحب الحوت" بھی قرآنی حکم ہے، یہ بھی بتایا جائے گا کہ انبیائے کرام کے ساتھ گستاخی اور سوء ادب بہت بڑا الزام ہے جس کا مرتکب کوئی مومن عالم دانستہ نہیں ہو سکتا اور یہ کہ خدا کے الفاظِ قرآنی کا ترجمہ کرنا سوء ادب نہیں ہے، یہ بھی تصریح کی جائے گی کہ انبیائے کرام کی اجتہادی خطا معاف ہو جاتی ہے اور ان پر رحمت و نعمت و اجتبا و اصطفا کی برکتیں نازل ہوتی ہیں اس لیے کسی غیر معلوم کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ ان چیزوں کی وجہ سے ان کی تنقیص کرے اور آخر میں عصمت انبیاء پر مختصر تحریر کیا جائے گا۔

ڈاکٹر رضوان علی صاحب کے مضمون" نور محمدیؐ اور حدیث جابرؓ" مطبوعہ جولائی سنہ ۱۹۹۷ء پر جو تفصیلی مضمون راقم نے لکھا تھا جس میں حدیثِ جابرؓ سے متعلق تائید کی گئی تھی، لیکن نور کے مفہوم میں نور محمدیؐ کی کلیۃً نفی کی تردید کی گئی تھی اور نور کے قرآنی و لغوی مفہوم کو واضح کیا گیا تھا کہ کن کن چیزوں پر نور کا اطلاق ہوا ہے اور حضور پاکؐ کے نور ہونے کا کیا مفہوم ہے، لیکن آپ نے وہ مضمون شایع نہیں فرمایا کیونکہ اس موضوع پر متعدد مخالف و موافق تحریریں

آپ کے پاس آئی تھیں۔ حالانکہ میرا مضمون انتہائی غیر جانبدارانہ تھا اور طرفین اس سے راضی ہوتے۔ یا تو مختلف فیہ مضامین شایع نہ فرمایا کریں یا پھر علمی طریقہ اختیار کریں کہ ایسے موضوعات پر تفصیلی مضامین، مکتوبات اور استدراکات سب مسلسل شایع کیا کریں، اگر معارف جیسا دقیع اور علمی رسالہ ان مختلف فیہ مسائل میں تشفی بخش بحث تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرے گا تو پھر دوسرے رسالے جو اپنے اپنے مکاتبِ فکر سے جڑے ہوئے اور جانبدار ہیں وہ یہ کام نہیں کر سکتے۔

بہر حال حضرت یونسؑ سے متعلق مضمون میں وہ تمام آیاتِ قرآنی زیر بحث آئیں گی جو حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق ہیں۔ تاکہ سید صاحب پر سبقتِ قلم اور سوء ادب کا شائبہ باقی نہ رہے۔

جبیب ریحان ندوی

(۳)

۲۳ر فروری و ۴ر مارچ ۹۸ء

گرامی قدر محترم مولانا اصلاحی صاحب/ حفظہ اللہ تعالیٰ! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

مزاج گرامی! ۸ر رمضان المبارک کا مرسلہ رجسٹرڈ گرامی نامہ اور "مولانا آزاد کے البلاغ" پر گرانقدر مضمون مجھے مکہ معظمہ کے سفر سے واپسی پر ایک عشرہ قبل موصول ہوا۔ جواب میں تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

۳ر جنوری سے ۳ر فروری تک سفر میں رہا۔ رمضان میں کہیں کے سفر کا پہلے سے کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اچانک یہاں کے ذمہ داروں نے دہلی اور وہاں سے عمرہ کے لیے روانہ ہونے کے لیے کہا۔ میں ابھی ایک سفر سے واپس آیا تھا اور تکان بھی دور نہیں ہوئی تھی، مجلہ کا

کام آخری مرحلہ میں تھا۔ سفر کے لیے طبیعت بالکل آمادہ نہیں تھی مگر تعمیل حکم کے علاوہ حرم کی حاضری اور اس کے دیدار سے بھلا کس کا جی بھرتا ہے، چنانچہ شام ہی کو دہلی کے لیے ایک طالبعلم کے ہمراہ روانہ ہوگیا۔ جسے مدرسہ کی طرف سے "دبئی کے عالمی مسابقۂ قرآن" میں شرکت کرنی تھی، یہ مقابلہ دبئی حکومت کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا تھا۔ جس میں ساٹھ ملکوں کے ایک ایک نمایندے شریک تھے، ہمارے یہاں کا طالب علم پورے ہندوستان کا تنہا نمایندہ تھا۔ ۶؍ جنوری کو اس کی فلائٹ تھی، وقت بہت کم تھا۔ بڑی مشکل سے اس کی کارروائی مکمل کرا کے روانہ کیا اور پھر اپنے عمرہ کے ویزا کے حصول میں لگ گیا۔ جو اس سال بڑی مشکل سے ملا اور ۱۲؍ جنوری / ۱۲؍ رمضان کو سعودی ایرلائنس سے پرواز کی، خدا کا شکر ہے کہ ۱۳؍ کی صبح حرم شریف پہنچ گیا، وقت بہت مصروف گزرا۔ ۲۰۔۲۲ رمضان کو دو دن کے لیے مدینہ منورہ حاضر ہو کر شرفِ زیارت حاصل کیا۔ حرمِ نبوی کے مطاف کی مزید توسیع ہوئی ہے ابھی ایک سال قبل اکتوبر ۹۶ء میں حاضر ہوا تھا تو نقشہ کچھ اور تھا۔ اس بار دیکھا تو چاروں طرف وسیع مطاف بن گیا ہے، بیشتر قریب کے مکانات اور دکانیں حرم میں داخل کرلی گئی ہیں۔ کچھ فاصلہ پر مزید نئے فلک بوس رہایشی ہوٹل وجود میں آگئے ہیں۔ تہہ خانوں میں وسیع سڑک نکالنا وہاں عام بات ہے۔ یہی حال مکہ مکرمہ کا بھی ہے ہر لمحہ تعمیر و توسیع کا کام جاری رہتا ہے۔ خانۂ کعبہ کی نئی تعمیر ہوئی ہے، حرم شریف کی رونق رمضان کے آخری عشرہ میں بہت بڑھ جاتی ہے۔ دسیوں لاکھ کا مجمع ہوتا ہے اور اکناف و اطرافِ عالم سے معتمرین پہنچ جاتے ہیں۔

۲۸؍ رمضان کو حرم شریف میں کچھ ہندوستانی اخوان کے ساتھ بیٹھے تھے کہ اپنے علاقہ کے ایک نوجوان مولانا لیث محمد ہندی نے جو جامعہ ام القریٰ میں دکتورہ کر رہے ہیں یہ اندوہناک خبر سنائی کہ دکتور محفوظ الرحمن کا دبئی اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ یہ خبر سُن کر ہم سب دم بخود

رہ گئے، باہر نکل کر دبئی فون سے خبر کی تصدیق کی۔ موصوف ڈاکٹر عبدالباری صاحب کے جن سے آپ واقف ہیں اور جو ہمارے ادارہ کے سکریٹری ہیں سگے بھتیجے تھے، ۸۳ء سے دبئی میں وزارۃ الشؤن والاوقاف والدعوۃ والارشاد سعودی عرب کی جانب سے داعی مبعوث تھے۔ ان کے ذریعہ ہمارے ادارہ کو بڑی ترقی نصیب ہوئی، کئی نئے شعبے کھل گئے۔ ٹکنیکل ادارہ قائم کیا۔ مجلہ الفرقان انہیں کی سرپرستی میں جاری ہوا۔

میرے سفر اور ادارہ کے صدر کی ناگہانی موت سے اس دفعہ مجلہ الفرقان جنوری فروری کا شمارہ تاخیر سے نکلے گا، موصوف کے انتقال سے ادارہ بھی متاثر ہوگا۔ ڈاکٹر عبدالباری صاحب فی الحال تین نفری وفد کے ساتھ تعزیت کے لیے دبئی تشریف لے گئے ہیں، ان کی واپسی پر صحیح صورت سامنے آئے گی۔

ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن موضع کنڈؤ ضلع گونڈہ کے رہنے والے تھے جو آپ کے ہم جماعت مولوی صغیر احمد صاحب اصلاحی مرحوم کا بھی وطن تھا، جن کے دولت خانہ پر آپ تشریف لے گئے تھے، ڈاکٹر محفوظ صاحب نے اب ڈومریا گنج میں اپنا ایک بہت خوبصورت مکان تعمیر کرایا ہے، ان کے والد مولانا زین اللہ صاحب رحمانی بھی عالمِ دین اور متقی شخص تھے۔ انہوں نے اپنے صاحبزادے کی تعلیم و تربیت کا بڑا خیال رکھا۔

ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن صاحب دارالعلوم دیوبند اور جامعہ سلفیہ بنارس سے فراغت کے بعد جامعہ سراج العلوم جھنڈانگر وغیرہ میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے بی۔ اے۔ ایم۔ اے کیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور چند برس تک وہیں کے شعبۂ مخطوطات سے وابستہ رہے، پھر دبئی کے شعبۂ مخطوطات سے متعلق ہوئے اور آخر میں مرکز الدعوۃ والارشاد دبئی سے ان کا تعلق ہوا اور اپنی وفات

تک اسی سے وابستہ رہ کر حدیث و علوم حدیث کے لکچرر رہے۔

موصوف نے حدیث کی جن بلند پایہ کتابوں کی تحقیق و تخریج کا کام کیا ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ الارسال فی مصطلح الحدیث ۲۔ تلخیص العلل المتناهیة فی الاحادیث الواهیة (امام ذہبی) ۳۔ العلل الواردة فی الاحادیث النبویه (امام دارقطنی) ۴۔ البحر الزخار المعروف به مسند البزار (حافظ ابوبکر بزار) ۵۔ مسند الهیثم بن کلیب الشاشی (۶) کتاب الرویة لابن النحاس (۷) مسند عمر بن الخطاب (ابوبکر النجاد) ۸۔ مسند للرویانی (۹) الکامل لابن عدی۔

مرحوم کو مسلمانوں کی علمی و تعلیمی پسماندگی کا بڑا دکھ تھا اور وہ مسلمانوں کی علمی و تعلیمی ترقی کے لیے بہت سرگرم عمل رہتے تھے، ٹکنیکل اداروں سے خاص دلچسپی تھی۔ جامعہ اسلامیہ خیر العلوم کے تو صدر ہی تھے جس کے تحت کلیة الطیبات للبنات، کلیة الشریعة، تحفیظ القرآن، مدرسہ دینیہ سلفیہ، دار الایتام، مرکز الدعوة الاسلامیة، مجلة الفرقان جیسے شعبے ابھی تک اچھے حال میں چل رہے ہیں، اس کے علاوہ خیر ٹکنیکل سنٹر، خیر آٹو موبائلس، اصلاح مساجد وغیرہ دوسرے کئی فلاحی اداروں کی بھی سرپرستی فرماتے تھے۔

مرحوم کے انتقال سے ڈاکٹر عبد الباری صاحب جو ان اداروں کے سکریٹری ہیں، بالکل بے دست و پا ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے اور اپنے خزانۂ غیب سے اداروں کی کفالت کا سامان مہیا کر دے۔ آمین

والسلام

مخلص: عبد المبین ندوی

مطبوعات جدیدہ

ایران کی چند اہم فارسی تفسیریں از جناب پروفیسر کبیر احمد جائسی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۰۰، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: انجمن فارسی، ۳۴۳۳ حویلی حسام الدین حیدر، بلی ماران، دہلی ۶-۱۱۰۰۰۔

لائق مولف ادبیات ایران کے متعلق اپنے مضامین اور کتابوں کی وجہ سے معروف ہیں، انہوں نے اس زبان کے اسلامی لٹریچر کی جانب بھی توجہ کی ہے، ان کا خیال ہے کہ فن تفسیر میں اہل ایران نے چند صدیوں میں اتنا بڑا سرمایہ جمع کر دیا جس کی نظیر دوسری زبانوں میں ملنی مشکل ہے، مگر افسوس ہے کہ یہ سرمایہ محفوظ نہیں رہا، البتہ چند قدیم ترین فارسی تفسیروں کے جو ناقص و ناتمام حصے موجود رہ گئے ہیں ان کو ایران و ہندوستان کے بعض فارسی محققوں مثلاً ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، مجتبیٰ مینوی، محمد روشن، جلال متینی، علی رواقی، محمود خاں شیرانی اور پروفیسر نذیر احمد نے پہلی بار قدردانوں کے سامنے پیش کیا، فاضل مولف نے ان ہی کی روشنی میں پانچ قدیم تفسیروں کا تعارف سلیقہ اور جامعیت سے کرایا ہے کہ ان کے اسلوب، فکر اور مسلک کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے، سبع مثانی، ہاروت و ماروت، احیائے طیر، استوائے عرش، حروف مقطعات، معجزہ شق القمر جیسے مباحث ان کے حسن انتخاب کا ثبوت ہیں، مباحث کی مزید توضیح کے لیے دور حاضر کی بعض اہم تفسیروں کی جانب بھی مراجعت کی گئی ہے اور جا بجا اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا گیا ہے، تفسیر سور آبادی کے تعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں اس کا مفسر ربط و نظم آیات کی اہمیت کا

معروف تھا، اس تفسیر کے نام کے متعلق لکھا ہے کہ صرف دو شہادتوں کی بنیاد پر اس کو "تفسیر التفاسیر" کا نام دینے سے گریز کیا گیا ہے، لیکن اس گریز کی یہ دلیل قوی نہیں معلوم ہوتی، ایک جگہ و قرأۃ او ملکین خواند نہ ملکین" کے ترجمہ میں ضرورت تھی کہ دونوں ملکین کی وضاحت اعراب یا معانی سے کردی جاتی۔ علوم القرآن سے شغف رکھنے والوں کے لیے اس پُر از معلومات کتاب کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔

احادیث میں مذکور نباتات، ادویہ اور غذائیں از جناب ڈاکٹر اقتدار فاروقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مع گرد پوش، صفحات ۲۴۸، قیمت ۹۰ روپے، پتہ: سدرہ پبلشرز، نعمت اللہ بلڈنگ، نعمت اللہ روڈ، امین آباد لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸۔

طب نبوی کے موضوع پر متعدد کتابیں شایع ہوچکی ہیں، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک مفید کڑی ہے جو اس جذبہ سے مرتب کی گئی ہے کہ "گو اور کتابوں میں ادویہ کی سائنسی پہچان کی کوشش کی گئی لیکن وہ سائنسی اعتبار و معیار سے قبولیت کے لائق نہ تھی، بہی، لوبان، کندر، عود الہندی، ورس اور کافور وغیرہ کی شناخت ایسے نباتاتی ناموں سے کی گئی جو سراسر غلط ہیں"۔ خوشی ہے کہ مصنف نے اس کی تلافی کی سعی کی ہے، اس سے پہلے بھی ان کی بعض کتابوں مثلاً نباتات قرآن اور قرآن کریم میں ذکر ثمرات نے قبول عام حاصل کیا ہے، اب اس کتاب میں انہوں نے احادیث شریفہ میں وارد بعض دواؤں، پودوں اور غذاؤں کا جائزہ موجودہ اصطلاحوں اور تشریحوں کی روشنی میں لیا ہے، ان کا مطالعہ وسیع ہے، مولانا سید سلیمان ندوی کی ایک رائے سے یہ کہہ کر اختلاف کیا ہے کہ "کافور یقیناً کوئی ایسی چیز تھی جس کی خوشبو اور شربتی خوبیوں سے عرب بخوبی واقف تھے۔ موجودہ کافور سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، مقدمہ اور مضمون طب نبوی میں کتاب کی روح آگئی ہے،

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد رابع ندوی اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کی تعارفی تحریروں سے بھی کتاب مزین ہے۔

حقیقت رجم ایک تنقیدی جائزہ از جناب ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۱۱۲، قیمت ۳۰ روپے پتہ: فردوس پبلی کیشنز، ۱۷۸۱، حوض سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

مولانا عنایت اللہ سبحانی نے حقیقت رجم کے نام سے جو کتاب لکھی تھی وہ بڑی متنازع بنی ہوئی ہے اور اب تک اس کے جواب میں کئی کتابیں شایع ہوچکی ہیں، جن میں مسئلہ کی معروف شکل سے مولانا سبحانی کے اختلاف و انحراف کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے، زیر نظر رسالہ کا تعلق اسی سلسلے سے ہے جو اپنے علمی لہجہ اور شائستہ اسلوب کی وجہ سے نمایاں ہے، گو بعض مقامات ذرا سخت و دشوار بھی آگئے ہیں، مثلاً یہ کہنا کہ "یہ رویہ اگرچہ بظاہر انکار سنت پر مبنی معلوم نہیں ہوتا لیکن درحقیقت اس میں اور انکار سنت میں ذرا سا بھی فرق نہیں"۔ بہرحال زیر بحث موضوع پر اس کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں۔

روضۃ الاولیاء تالیف علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی، ترجمہ جناب پروفیسر نثار احمد فاروقی، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۱۶، قیمت ۵۲ روپے پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶۔

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی متوفی ۱۲۰۰ھ مدفون خلد آباد نے خلد آباد (اورنگ آباد) کے صوفیائے عشرہ کا ایک مختصر لیکن بڑا دلآویز تذکرہ مرتب کیا تھا، ایک صدی قبل یہ مطبوع ہوکر اب نایاب تھا اس لیے فاضل محقق جناب پروفیسر نثار احمد فاروقی نے اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے اردو قالب میں منتقل کرکے اصل متن کے ساتھ شایع کیا ہے، ترجمہ کی

سلاست و شگفتگی کے لیے ان کا نام ہی کافی ضمانت ہے، مقدمہ مختصر مگر جامع ہے، اس مفید تذکرہ کی اشاعت کے لیے جامع العلوم فرقانیہ رام پور اور ڈاکٹر شعائر اللہ خاں بھی لائق ستائش ہیں۔

ٹمل ناڈو کے صاحب تصنیف علماء

از جناب علیم صبا نویدی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۹۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: ۲۶ امیر النساء بیگم، مونٹ روڈ، مدراس ۲.....۶۔

ٹامل ناڈو جنوبی ہند کا وہ مبارک خطہ ہے جس کو ہندوستان میں آفتاب اسلام کے مطلع اول کا فخر حاصل ہے، صدیوں سے یہ علماء و فضلا و صوفیہ کے وجود سے معمور رہا ہے، اردو کا مولد و منشا نہ ہونے کے باوجود اس زبان کے فروغ و ارتقا میں اس کا حصہ کم نہیں رہا، زیر نظر وقیع تذکرہ اس کا ثبوت ہے، جس میں سترہویں صدی سے عہد حاضر تک قریباً ڈیڑھ سو اہل علم و قلم کا ذکر آگیا ہے، فاضل مولف معروف و مشاق اہل قلم اور صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، یہ کتاب بھی ان کے تحقیقی ذوق و سلیقہ کا عمدہ نمونہ ہے، البتہ کمپیوٹر کی کتابت کے اغلاط کثرت سے ہیں۔

تلمیحات و اشارات حافظ

از جناب محمد ذاکر حسین ندوی، عمدہ کاغذ و طباعت صفحات ۸۸، قیمت ۲۰ روپے، پتہ: بک امپوریم سبزی باغ، پٹنہ۔

خواجہ حافظ شیرازی کے کلام مقبول انام کے خصائص میں صنعت تلمیح کا مشاقانہ استعمال بھی شامل ہے، آیات و احادیث اور ضرب الامثال کی تلمیحوں اور اشاروں سے ان کے اشعار پر ہیں، اس صنعت لطیف سے لطف اندوز ہونے کے لیے تلمیح کے پس منظر سے واقفیت ضروری ہے، لائق شارح نے اسی مقصد سے مختصر تشریحوں کے ذریعہ ان تلمیحات کو جمع کرنے کی لائق تحسین کوشش کی ہے، کلام حافظ کے شیدائی اب بھی کم نہیں، یہ مختصر رسالہ ان کی دلچسپی کا اچھا سامان ہے۔

(ع۔ ص)